اکتوبر ۱۹۷۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

و قد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین (القرآن)

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۲۰ | اکتوبر ۱۹۷۳ء | شمارہ ۱۰-۹

فہرست مضامین

کلا انها تزکرة	فضیلت رمضان اور حقیقت صوم		۱ تا ۱۶
تدبر قرآن	تفسیر سورہ ہود (۲)	مولانا امین احسن اصلاحی	۱۷
مقالات	مولانا حمیدالدین فراہیؒ کی علمی خدمات	ڈاکٹر سعید احسن عابدی	۳۷
	جمع و تدوین قرآن	سید صدیق حسن مرحوم	۴۱
سیرت و سوانح	حضرت ابوبکر صدیق غیروں کی نظر میں	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	۵۹

* مدیر مسؤل *

ڈاکٹر اسرار احمد

ایم-بی-بی-ایس (پنجاب) ایم-اے اسلامیات (کراچی)

* یکے از مطبوعات *

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۱۲ - افغانی روڈ، سمن آباد، لاہور (فون: ۶۸۲۴۵)

قیمت فی پرچہ: ایک روپیہ

فہرست مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

☆

تصانیف امام حمید الدین فراہیؒ

☆ مجموعہ تفاسیر فراہیؒ — ہدیہ -/۲۴

☆ اقسام القرآن اردو ترجمہ الامعان فی اقسام القرآن (زیر طبع)

☆ ذبیح کون ہے؟ اردو ترجمہ القول الصحیح فی من ھو الذبیح (,,)

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

☆ سلسلۂ تدبر قرآن :

- مبادیٔ تدبر قرآن : تدبر قرآن کے اصول و قواعد پر اہم دستاویز ہدیہ -/۶
- مقدمہ تدبر قرآن و تفاسیر آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ ہدیہ -/۲
- تدبر قرآن جلد اول مشتمل بر مقدمہ و تفسیر از ابتداء تا سورۂ آل عمران ہدیہ -/۳۶
- تدبر قرآن جلد دوم مشتمل بر تفسیر سورۂ نساء تا سورۂ اعراف -/۳۲
- تدبر قرآن جلد سوم مشتمل بر تفسیر سورۂ انفال تا سورۂ بنی اسرائیل -/۳۲

☆ حقیقت دین : مشتمل بر حقیقت شرک ، حقیقت توحید ، حقیقت تقویٰ اور حقیقت نماز -/۱۲

☆ دعوت دین اور اس کا طریق کار -/۵

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ

فضیلتِ رمضان

اور

حقیقتِ صوم

آیت قرآنی مع ترجمہ .... صفحہ ۲ و ۳
خطبہ نبوی مع ترجمہ .... " ۴ و ۵

روزہ اور اسکی روحانی برکات
ازقلم مولانا امین احسن اصلاحی ... " ۶

رمضان المبارک اور اسکی خصوصیات
ازقلم مولانا عبدالغفار حسن ... " ۱۰

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۱۲- افغانی روڈ سمن آباد لاہور

فون ۶۸۲۴۵

قیمت: بیس پیسے

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

★

شَهْرُ رَمَضَانَ
الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ
هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی
وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْکُمُ الشَّهْرَ
فَلْیَصُمْهُ ۖ وَمَنْ کَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی
سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ۖ
یُرِیْدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ
بِکُمُ الْعُسْرَ وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّةَ
وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىکُمْ
وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۝

★

(سورۃ بقرہ - آیت ۱۸۵)

رمضان کا مہینہ ہے

جس میں قرآن اتارا گیا

لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق و باطل کے امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ، سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو وہ اس کے روزے رکھے، اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا اور چاہتا ہے کہ تم تعداد پوری کرو۔ اور اللہ نے جو تمہیں ہدایت بخشی ہے اس پر اُس کی بڑائی کرو اور تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو۔

بقرہ، ۱۸۵

ترجمہ:- ماخوذ از "تدبر قران"۔ مولانا امین احسن اصلاحی

رمضان کی آمد پر

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ایک خطبہ

عَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ اٰخِرِ يَوْمٍ مِّنْ شَعْبَانَ فَقَالَ: "يَا
اَيُّهَا النَّاسُ فَقَدْ اَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيْمٌ شَهْرٌ مُّبَارَكٌ
شَهْرٌ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهٗ
فَرِيْضَةً وَّقِيَامَ لَيْلِهٖ تَطَوُّعًا. مَنْ تَقَرَّبَ فِيْهِ بِخَصْلَةٍ
مِّنَ الْخَيْرِ كَانَ كَمَنْ اَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ وَمَنْ
اَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْهِ كَانَ كَمَنْ اَدّٰى سَبْعِيْنَ فَرِيْضَةً
فِيْمَا سِوَاهُ وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ وَالصَّبْرُ ثَوَابُهُ الْجَنَّةُ وَشَهْرُ
الْمُوَاسَاةِ وَشَهْرٌ يُزَادُ فِيْهِ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ. مَنْ فَطَّرَ فِيْهِ
صَائِمًا كَانَ لَهٗ مَغْفِرَةً لِّذُنُوْبِهٖ وَعِتْقُ رَقَبَتِهٖ مِنَ النَّارِ
وَكَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يُّنْتَقَصَ مِنْ اَجْرِهٖ شَيْءٌ قُلْنَا
يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَيْسَ كُلُّنَا يَجِدُ مَا يُفَطِّرُ بِهِ الصَّائِمَ فَقَالَ رَسُوْلُ
اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِي اللّٰهُ هٰذَا الثَّوَابَ مَنْ فَطَّرَ
صَائِمًا عَلٰى مَذْقَةِ لَبَنٍ اَوْ شَرْبَةٍ مِّنْ مَّاءٍ وَمَنْ اَشْبَعَ
صَائِمًا سَقَاهُ اللّٰهُ مِنْ حَوْضِيْ شَرْبَةً لَا يَظْمَأُ حَتّٰى يَدْخُلَ الْجَنَّةَ
وَهُوَ شَهْرٌ اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ وَّاَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ وَّاٰخِرُهٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ وَ
مَنْ خَفَّفَ عَنْ مَّمْلُوْكِهٖ فِيْهِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ وَاَعْتَقَهٗ مِنَ النَّارِ ۝

—— رواہ البیہقی فی شعب الایمان

ترجمہ :

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ماہ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک خطبہ دیا۔ اس میں آپؐ نے فرمایا :-

"اے لوگو! تم پر ایک عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے۔ اس مبارک مہینہ کی ایک رات (شب قدر) ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کئے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہ خداوندی میں کھڑا ہونے (یعنی نماز تراویح پڑھنے) کو نفل عبادت مقرر کیا ہے (جس کا بہت بڑا ثواب رکھا ہے) جو شخص اس مہینے میں اللہ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے کوئی غیر فرض عبادت (یعنی سنت یا نفل) ادا کرے گا تو اس کو دوسرے زمانہ کے فرضوں کے برابر اس کا ثواب ملے گا اور اس مہینہ میں فرض ادا کرنے کا ثواب دوسرے زمانہ کے ستر فرضوں کے برابر ملے گا۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور غم خواری کا مہینہ ہے اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں مومن بندوں کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے جس نے اس میں کسی روزہ دار کو (اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کے لئے) افطار کرایا، تو اس کے گناہوں کی مغفرت اور آتش دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائے گا، بغیر اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے آپؐ سے عرض کیا گیا کہ :- یا رسول اللہ! ہم میں سے ہر ایک کو تو افطار کرانے کا سامان حاصل نہیں ہوتا (تو کیا غریب اس ثواب سے محروم رہیں گے؟ آپؐ نے فرمایا کہ : اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دے گا جو دودھ کی ٹھوڑی سی لسی پر یا صرف پانی ہی کے ایک گھونٹ پر کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرا دے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے ارشاد فرمایا کہ) اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلا دے اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض (یعنی کوثر) سے ایسا سیراب کرے گا جس کے بعد اس کو کبھی پیاس ہی نہیں لگے گی تا آنکہ وہ جنت میں پہنچ جائے گا (اس کے بعد آپ نے فرمایا) اس ماہ مبارک کا ابتدائی حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ آتش دوزخ سے آزادی ہے (اس کے بعد آپؐ نے فرمایا) اور جو آدمی اس مہینے میں اپنے غلام و خادم کے کام میں تخفیف و کمی کر دے گا اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا اور اس کو دوزخ سے رہائی اور آزادی دے دے گا۔"

(ترجمہ ماخوذ از معارف الحدیث، مولانا محمد منظور نعمانی)

مولانا امین احسن اصلاحی

روزہ

اور اُس کی رُوحانی برکات

شہوات اور خواہشاتِ نفس کے غلبہ سے انسان کے اندر خدا سے جو غفلت اور اس کے حدود سے جو بے پروائی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ نے روزے کی عبادت مقرر کی ہے۔ اس عبادت کا نشان تمام قدیم مذاہب میں بھی ملتا ہے۔ بالخصوص تزکیہ نفس کے جتنے طریقے بھی غلط یا صحیح، دنیا میں اب تک اختیار کئے گئے ہیں، ان سب میں اس عبادت کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مذاہب کے مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ پچھلے ادیان میں اس کے آداب و شرائط اسلام کی نسبت زیادہ سخت تھے۔ اسلام دینِ فطرت ہے اس وجہ سے اس نے اس کی ان پابندیوں کو نسبتاً نرم کر دیا ہے جو انسان کی عام طاقت کے تحمّل سے زیادہ تھیں جن کو صرف خاص خاص لوگ ہی برداشت کر سکتے تھے۔

یہ عبادت نفس پر شاق ہونے کے اعتبار سے تمام عبادات میں سب سے نمایاں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس انسانی کی تربیت و اصلاح میں اس کا عمل بڑا مشکل ہے۔ یہ انسان کے نہایت سرکش اور منہ زور رجحانات پر کمند ڈالتی اور ان کو رام کرتی ہے۔ اس وجہ سے یہ عین اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کے مزاج میں سختی اور درشتی ہو۔

نفس انسانی کے جو پہلو سب سے زیادہ زوردار ہیں، ان میں شہوات، خواہشات اور جذبات سب سے زیادہ نمایاں ہیں ان کی فطرت میں اشتعال، ہیجان اور جوش ہے اس وجہ سے ارادہ کو ان پر قابو پانے کے لئے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ یہ ریاضت اتنی سخت اور ہمت شکن ہے کہ قدیم مذاہب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تزکیہ نفس کے بہت سے طالبین سرے سے اس چیز ہی سے مایوس ہو گئے کہ ان کو قابو میں بھی لایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان کو قابو میں لانے اور ان کی تربیت کرنے کے بجائے ان کے

یک قلم ختم کر دینے کی تجویزیں سوچیں اور اختیار کیں۔ لیکن اسلام ایک دین فطرت ہے اور یہ چیزیں بھی انسانی فطرت کے لازمی اجزا میں سے ہیں جن کے بغیر انسان کے شخصی اور نوعی تقاضوں کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے اس نے ان کو ختم کر دینے کی اجازت نہیں دی ہے بلکہ ان کو قابو میں کر کے ان کو صحیح راہ پر لگانے کا حکم دیا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کو قابو میں کرنا ان کو ختم کر دینے کے مقابل میں کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ ایک منہ زور گھوڑے کو ختم کر دینا ہو تو اس کے لئے زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ بندوق کی ایک گولی اس کو ٹھنڈا کر دینے کے لئے بالکل کافی ہے۔ لیکن اگر اس کو رام کر کے سواری کے کام میں لانا ہے تو یہ مقصد ایک ماہر شہسوار بڑی ریاضتوں، بڑی مشقتوں اور بہت سے خطرات کا مقابلہ کرنے کے بعد ہی حاصل کر سکتا ہے۔

روزے کی عبادت اسلام نے اس لئے مقرر فرمائی ہے کہ ایک طرف نفس انسانی کے یہ سرکش رجحانات ضعیف ہو کر اعتدال پر آئیں اور دوسری طرف انسان کی قوتِ ارادی ان کو دبانے اور ان کو حدود الٰہی کا پابند بنانے کے لئے طاقتور ہو جائے۔ اپنے اس دوطرفہ عمل کے سبب سے تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے، جیسا کہ ہم نے عرض کیا اس عبادت کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی برکات کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ پہلے اس کی چند برکات کا ذکر کریں گے اس کے بعد اس کی آفات بیان کریں گے۔

رُوحِ ملکوتی کی آزادی

روزے کی سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ اس سے انسان کی روح ملکوتی کو نفسانی خواہشات کے دباؤ سے بہت بڑی حد تک آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ ہماری روحِ ملکوتی کا حقیقی میلان ملاءِ اعلیٰ کی طرف ہے وہ فطری طور پر خدا کے تقرب، ملائکہ سے تشبہ اور سفلیات سے تجرد کی طالب ہے اور مادی زندگی کے تقاضوں میں گرفتار رہنے کے بجائے اعلیٰ عقلی و اخلاقی مقاصد کے لئے پرواز کرنا چاہتی ہے۔ روح کے تقاضوں اور نفس کے ان مطالبات میں جو خواہشات و شہوات سے پیدا ہوتے ہیں، ایک کھلا ہوا تضاد ہے۔ ان دونوں میں اکثر تصادم رہتا ہے اور اس تصادم میں اکثر جیت خواہشات و شہوات ہی کو ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خواہشات و شہوات کے مطالبے پورے کرنے سے انسان کو فوری لذت و راحت حاصل ہوتی ہے۔ برعکس اس کے رُوح کے مطالبات پورے کرنے سے انسان کو کوئی فوری لذت حاصل نہیں ہوتی بلکہ اُلٹے اس کے لئے انسان کو اپنی بہت سی فوری لذتوں اور راحتوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

یہ صورت حال، ظاہر ہے کہ روح کے فطری میلانات کے بالکل خلاف ہے۔ اگر یہی حالت عرصہ تک باقی رہ جائے اور روح کو اپنی پسند کے میلانوں میں جولانی کا کوئی موقع نہ ملے تو نہ صرف یہ کہ اس کی قوتِ پرواز ختم ہو جاتی

ہے بلکہ آہستہ آہستہ وہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔

روزہ اس صورت میں وقتاً فوقتاً تبدیلی کرتا رہتا ہے۔ یہ ان چیزوں پر بہت سی پابندیاں عائد کر دیتا ہے جو شہوات و خواہشات کو تقویت پہنچانے والی ہیں۔ اس سے آدمی کا کھانا پینا اور سونا سب کم ہو جاتا ہے۔ دوسری لذتوں اور دلچسپیوں پر بھی بعض پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں۔ ان چیزوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ نفس کے شہوانی میلانات کی جولانیاں بہت کم ہو جاتی ہیں اور روح ملکوتی کو اپنی پسند کے میدانوں میں جولانی کے لئے موقع مل جاتا ہے۔

روزے کی یہی خصوصیت ہے جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے ساتھ ایک خاص نسبت دی ہے اور روزہ دار کو خاص اپنے ہاتھ سے اس کے روزے کی جزا دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ یوں تو اسلام نے جتنی عبادتیں بھی مقرر فرمائی ہیں سب اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں لیکن روزے میں دنیا اور لذات دنیا کو ترک کر کے بندہ خدا سے قرب اور اس کے ملائکہ سے مناسبت اور تشبہ حاصل کرنے کی جو کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں جو مشقت اٹھاتا ہے وہ روزے کے سوا کسی دوسری عبادت میں اس قدر نمایاں نہیں ہے۔ فقر، درویشی، زہد، تجرد، ترک دنیا اور تبتل الی اللہ کی جو شان اس عبادت میں ہے وہ اس کا خاص حصہ ہے بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں ہے کہ رہبانیت جس حد تک اسلام میں رکھی گئی ہے اور جس درجہ تک اللہ تعالیٰ نے تربیت نفس کے لئے اس کو پسند فرمایا ہے اسلام میں یہی عبادت اس کا مظہر ہے۔ اگر ایک بندہ روزے کی ساری مشقتیں اور پابندیاں فی الحقیقت اسی لئے جھیلتا ہے کہ اس کی روح اس عالم ناسوت کی دلدل سے آزاد ہو کر عالم لاہوت کی طرف پرواز کر سکے اور اسے خدا کا قرب حاصل ہو سکے تو بلاشبہ اس کی یہ کوشش اسی چیز کی مستحق ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ساتھ ایک خاص نسبت دے اور اس کی جزا خاص اپنے ہاتھوں سے دے۔ ایک حدیث کا ترجمہ ملاحظہ ہو جس میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے:-

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابن آدم کا ہر عمل اس کے لئے ہے۔ مگر روزہ، یہ میرے لئے ہے، اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ روزہ ایک سپر ہے جب کسی کا روزہ ہو تو اسے چاہیئے کہ نہ شہوت کی کوئی بات کرے اور نہ شور و شغب کرے۔ اگر کوئی شخص اس سے گالم گلوچ کرے یا لڑے جھگڑے تو وہ اس سے کہہ دے کہ بھائی میں روزے سے ہوں۔ اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں محمدؐ کی جان ہے۔ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک اس کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ روزہ کھولتا ہے، اور دوسری اس کو اس وقت حاصل ہوگی جب وہ اپنے رب سے ملے گا۔"

ایک دوسری روایت میں اسی سلسلہ کی کچھ اور باتیں ہیں جن سے حدیث کی اصل حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس وجہ سے ہم اس روایت کا ترجمہ بھی یہاں دیئے دیتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا، بندہ اپنا کھانا اور پینا اور اپنی شہوت میرے لئے چھوڑتا ہے، روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ نیکیوں کا بدلہ دس گنا ہے (مسلم کے الفاظ ہیں کہ) نیکیاں دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک بڑھائی جائیں گی۔ مگر روزے کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ بندہ اپنا کھانا پینا اور اپنی خواہش میرے لئے قربان کرتا ہے۔ روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی اس کو افطار کے وقت حاصل ہوگی دوسری خوشی اس کو اپنے رب کی ملاقات کے وقت حاصل ہوگی اور اس کے منہ کی بُو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔"

ان دونوں روایتوں کو ملا کر غور کرنے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کو اپنی طرف خاص نسبت کیوں دی ہے؟ اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خاص اپنے ہاتھ سے اس کا بدلہ دینے کا مطلب کیا ہے؟

اس کو اپنے لئے خاص قرار دینے کی وجہ تو یہ ہے کہ بندہ محض اس کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے اپنی ان خواہشوں اور اپنے نفس کے ان مطالبات کو ترک کرتا ہے جن کا اس کے نفس پر سب سے زیادہ غلبہ ہوتا ہے اور جن کے اندر اس کی تمام مادّی خوشیاں اور تمام مادّی لذّتیں سمٹی ہوئی ہیں ان لذّتوں سے محض اللہ کی رضا کے لئے منہ موڑ لینا اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند ہے کہ اس کو اس نے محبوبیت کا ایک خاص درجہ دیا اور فرمایا کہ بندہ روزہ خاص میرے لئے رکھتا ہے اور میری خوشی کے لئے اپنا کھانا پینا اور اپنی لذّتوں کو چھوڑتا ہے۔

خاص اپنے ہاتھ سے بدلہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کے بدلہ کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں بندھے ہوئے قاعدے ہیں۔ حالات و خصوصیات کے لحاظ سے ہر نیکی کا دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک بدلہ ملے گا۔ مثلاً فرض کیجئے ایک نیکی سازگار حالات کے اندر کی گئی ہے اور دوسری نیکی مشکل حالات کے اندر کی گئی ہے یا ایک نیکی پوری احتیاط اور پوری نگہداشت کے ساتھ کی گئی ہے اور دوسری نسبتاً کم اہتمام اور کم نگہداشت کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس طرح کے فرق و اختلافات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر شخص کی نیکی کا جو اجر ہونا چاہیئے وہ مذکورہ بالا اصول کے مطابق خدا کے رجسٹر میں درج ہوگا اور ہر حقدار اس اجر کو حاصل کرے گا۔ لیکن روزے کی جو عبادت ہے اس کا صلہ اللہ تعالیٰ نے اس فارمولے کے تحت نہیں رکھا ہے بلکہ اس کا فیصلہ کسی اور فارمولے کے مطابق ہوگا جس کا علم صرف اسی کو ہے۔

(ماخوذ از "تزکیہ نفس"، تالیف مولانا امین احسن اصلاحی)

مولانا عبد الغفار حسن

رمضان المبارک
اور اس کی خصوصیات

رمضان کی خصوصیات

رمضان کا مبارک اور مقدس مہینہ جن خصوصیات اور محاسن کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، ان سب کی تفصیل تو اس مضمون میں ناممکن ہے۔ اس موقع پر صرف چند اہم اور نمایاں خصوصیات روزہ، قیام اللیل، اجتماعیت، تلاوت قرآن، دعا، انفاق فی سبیل اللہ، لیلۃ القدر اور اعتکاف کی تشریح اور تقاضوں کو بیان کرتے ہوئے ان کے نتائج اور ثمرات کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔

روزے کے ثمرات

(۱) روزے کا پہلا ثمرہ ایمان کی ازسرنو تازگی اور شادابی ہے۔ اللہ تعالےٰ کی صفات خصوصاً اس کے علیم وخبیر اور مالک یوم الدین ہونے پر جس طرح روزہ یقین پیدا کرتا ہے وہ اپنی تاثیر کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ روزے کی حالت میں بھوک پیاس کی شدت اور جنسی خواہشات کے ہیجان پر وہی شخص قابو پا سکتا ہے جو مذکورہ بالا خدائی صفات پہ ایمان رکھتا ہو۔ قانون کے ڈنڈے اور پولیس کے پہروں کے بغیر ایک مسلمان اپنے ایمانی تقاضے کی بنا پر ہی اس فرض کو انجام دے سکتا ہے اور یہ چیز اس کی ایمانی قوت و حرارت میں مزید اضافہ کا سبب بنتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ افراد کی اصلاح کے لیے دو قسم کے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ (۱) باطنی یعنی قلبی کیفیات اور اندرونی حالت میں انقلاب و تبدیلی پیدا کی جائے (۲) ظاہری یعنی بیرونی دباؤ اور تعزیری قوانین کے ذریعے برائیوں کو روکنے اور نیکیوں کو نشوونما دینے کی کوشش کی جائے۔

اسلام نے یہ دونوں طریقے اختیار کئے ہیں لیکن اس نے پہلے زیادہ توجہ باطنی اصلاح پر دی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے :۔

الا ان فی الجسد مضغۃً اذا صلحت صلح الجسد کلہٗ و اذا فسدت فسد الجسد کلہ الا و ھی القلبُ۔
بخاری مسلم۔ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۴

سنو جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اگر وہ درست ہوجائے تو سارا جسم درست ہوجاتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارے جسم میں بگاڑ ہوجاتا ہے۔ آگاہ رہو یہ لوتھڑا دل ہے۔

قلبی کیفیات کو بدلنے اور پاکیزہ میلانات کو پیدا کرنے کے لیے نماز کے بعد اگر کسی عبادت کا مقام ہوسکتا ہے تو وہ روزہ ہے۔

(۲) روزے کا دوسرا پھل اخلاص ہے۔ دوسری عبادات کا علم کسی نہ کسی طرح دوسرے افراد ہوسکتا ہے۔ لیکن روزہ ایک ایسی عبادت ہے کہ جب تک خود روزہ دار ہی اپنی زبان سے اس کا اظہار نہ کرے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اس عبادت میں ریاکاری اور نمائش کا کم سے کم امکان پایا جاتا ہے۔ اسی بنا پر حدیثِ قدسی میں ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

الصوم لی و انا اجزی بہٖ
بخاری مسلم مشکوٰۃ ص ۱۷۳ ج ۱

روزہ میرے لیے ہے، اور میں ہی اسکی جزا دونگا۔

(۳) روزے کی بنا پر انسان میں صبر یعنی ضبطِ نفس اور اپنی خواہشات پہ قابو پانے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس حدیث میں رمضان کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ ھو شھر الصبر مشکوٰۃ ص ۱۷۳ بحوالہ بیہقی۔
یہ بھی واضح رہے کہ اصحابِ صبر کے لیے خدا کے ہاں ثواب بھی ان گنت ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:۔

انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب۔ سورہ زمر پ ۲۴۔ صبر والے خدا کے ہاں اپنا اجر بے حساب پائیں گے۔

(۴) روزے کی وجہ سے انسان میں جذبۂ شکر ابھرتا ہے اور خدا کی نعمتوں کی قدر و منزلت اسے معلوم ہوتی ہے اور پھر یہ جذبہ اپنے محسنِ حقیقی کی محبت سے وابستہ کر دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب مقامِ محبت حاصل ہوجائے تو پھر عبادت و اطاعت کی مثالیں بھی دوچند ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔

و لتکبرو اللہ علی ماھداکم و لعلکم تشکرون؛ سورہ بقرہ پ ۲

یعنی اللہ تعالےٰ نے جو ہدایت کی نعمت تمہیں بخشی ہے اس پر تم اسکی بڑائی بیان کرو تاکہ تم (احسانات کا) شکر ادا کرو۔

اسی جذبۂ شکر کو ابھارنے کے لیے ایک حدیث میں حکم دیا گیا ہے کہ دنیاوی لحاظ سے ان لوگوں کو دیکھو جو تم سے کم تر ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم ان نعمتوں کو حقیر نہ سمجھو گے جو اللہ تعالےٰ نے تمہیں عطا کی ہیں (بخاری مسلم مشکوٰۃ ص ۴۴۲ ج ۲) روزے کے افطار کے وقت خاص طور پہ اس دعا کے پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے۔

اللّٰھم لک صمت وعلیٰ رزقک افطرت ذھب الظمأ وابتلّت العروق وثبت الاجر ان شاء اللہ تعالیٰ
ابوداؤد، مشکوٰة ص ۱۷۵ ج ۱

اے اللہ میں نے تیرے لیے روزہ رکھا اور تیرے دیئے ہوئے رزق پہ میں نے افطار کیا، پیاس بجھ گئی رگیں تر ہو گئیں۔ اور خدا کے ہاں اجر ثابت ہو گیا انشاء اللہ۔

اس دعا میں بھی اعترافِ نعمت ہے اور جذبۂ شکر ابھارنے کی نمایاں طور پہ تربیت دی گئی ہے۔

(۵) روزہ انسان میں ہمدردی اور غم خواری کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ جیساکہ حدیث میں ہے جس نے روزے دار کو روزہ افطار کرا دیا، تو اس کو بھی روزے دار کے برابر ثواب ملے گا۔ اور جس نے پیٹ بھر کر کسی روزے دار کو کھانا کھلایا۔ اسے اللہ تعالےٰ حوضِ کوثر کا جام پلائے گا۔ کہ میدان محشر میں پیاس ہی محسوس نہ ہوگی اور جس نے اپنے غلام یا ماتحت شخص سے کام لینے میں نرمی برتی، اللہ تعالےٰ اس کی گردن کو جہنم سے آزاد کر دے گا۔ بیہقی۔ مشکوٰة ص ۱۷۴ ج ۱

قیام اللیل

رمضان المبارک کی دوسری خصوصیت رات کا قیام یعنی شب بیداری ہے۔ جیساکہ حدیث میں ہے۔

من قام رمضان ایمانًا احتسابًا غفرله ماتقدم من ذنبه،
بخاری، مسلم، مشکوٰة ص ۱۷۳ ج ۱

جس نے رمضان میں ایمان کی بنا پہ اور ثواب کی امید میں قیام اللیل کیا۔ اس کے اگلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

قیام اللیل میں نفس کی تربیت جس طرح ہوتی ہے اس کی وضاحت اس انداز سے کی گئی ہے :-

ان ناشئة اللیل ھی اشدّ وطأً واقوم قیلا۔ سورہ مزّمّل پ ۲۹

بلاشبہ رات کا اٹھنا نفس کو کچلنا اور بات کے درست ہونے کے لیے زیادہ سازگار ہے۔

رات کے آخری حصہ میں نرم گرم بستر چھوڑ کر اللہ کی یاد کے لیے اٹھنا نفس پہ انتہائی شاق گزرتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس پُرسکون فضا میں اپنے رب سے مناجات اور سرگوشی کرنے میں جو لطف حاصل ہو سکتا ہے اس کا دسواں حصہ بھی دن کے ہنگامہ پرور اوقات میں میسّر نہیں آسکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو دوسرے مہینوں کی نسبت رمضان میں شب بیداری کا خصوصی طور پہ اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ لیکن آخری عشرے میں آپ کی جدوجہد اور بھی زیادہ تیز ہو جاتی تھی، جیساکہ حدیث میں ہے۔

اذا دخل العشر الاخر شدّ مئزره واحیٰی لیلة وایقظ اھله
بخاری مسلم۔ مشکوٰة ص ۱۸۲ ج ۱

جب (آخری) عشرہ شروع ہوتا تو اپنی کمر کس لیتے۔ رات جاگ کر گزارتے اور گھر والوں کو بھی بیدار کرتے۔

قرآن کا دور

رمضان المبارک کی تیسری خصوصیت اس ماہ میں نزول قرآن ہے جیسا کہ ارشاد ہے :-

شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ۔ سورہ بقرہ پ ۲

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔

یہ انداز بیان ظاہر کر رہا ہے کہ رمضان اور قرآن کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رمضان قرآن کی سالگرہ منانے کا مہینہ ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مہینے میں جبرئیل کے ساتھ قرآن کا دور فرمایا کرتے تھے۔ آخری سال آپ نے دو بار دور فرمایا۔ صحیح بخاری مشکوٰۃ ص ۱۸۴ ج ۱

یہاں یہ بات واضح رہے کہ قرآن کے نزول کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن کو پوری تیزی کے ساتھ بے سمجھے بوجھے تراویح میں پڑھ لیا جائے۔ بلکہ قرآن مجید کا حق صحیح معنی میں اس وقت ادا ہو سکتا ہے جب کہ اس کے نزول کے تین مقاصد پیش نظر رکھے جائیں۔

(۱) لتقرأہ علی الناس علی مکث (سورہ بنی اسرائیل پ ۱۵)

(۱) ہم نے قرآن کو اتارا ہے تاکہ اسے آپ ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے پڑھیں۔

(۲) کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا ایاتہ ۔

(۲) ہم نے برکت والی کتاب نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں۔ اور تدبر سے کام لیں۔

(۳) انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ ۔ سورہ نساء پ ۵

(۳) ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب اتار دی تاکہ اللہ تعالےٰ نے جو راہ آپ کو دکھائے ہیں اس کے مطابق آپ فیصلہ کریں۔

یعنی انسان اپنے نفس پر، اپنے گھر پر، ماحول پر، پورے ملک پر، بلکہ پوری دنیا پر، اللہ تعالےٰ کی کتاب کے غلبہ اور حکمرانی کو قائم کرنے کی جد وجہد میں لگ جائے۔ زندگی کا کوئی شعبہ اور معاشرہ کا کوئی حصہ بھی اس کی رہنمائی سے خالی نہ رہے۔

انفاق فی سبیل اللہ

رمضان المبارک کی چوتھی خصوصیت اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے :-

اَطلَقَ کُلَّ اَسِیرٍ واعطیٰ کُلَّ سائلٍ ۔ بیہقی، مشکوٰۃ، ص ۱۷۳ ج ۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس ماہ تمام قیدیوں کو آزاد فرما دیتے اور ہر سائل کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتے۔

دوسری حدیث میں آپ کی سخاوت کو کثرت و زیادتی کے لحاظ سے تیز ہوا (الریح المرسلہ) سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ بخاری مسلم۔ مشکوٰۃ ص ۱۷۳ ج ۱

اللہ تعالےٰ کے احسانات خصوصاً نعمتِ قرآن کا شکر اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس ماہ میں کثرت سے غربا و مساکین کی مدد کی جائے۔ اور نیک کاموں میں آپس میں ایک دوسرے سے تعاون کیا جائے۔ اسی طرح روزے دار اس ماہ میں اپنے دل سے بخل کے میل کچیل کو دور کر سکتا ہے اور اسے سخاوت و فیاضی کا خوگر بنا سکتا ہے۔ ان تمام خصوصیات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رمضان المبارک کے ذریعے عبادتِ خالق اور خدمتِ خلق دونوں کی تربیت دی گئی۔

اجتماعیت رمضان المبارک کی پانچویں خصوصیت۔ اس میں اجتماعیت کا پہلو ہے۔ یہ وہ فضیلت ہے جو رمضان المبارک کے تمام احکام و عبادات میں نمایاں ہے۔ روزہ رکھنے کا معاملہ ہر شخص کے صوابدید پر نہیں چھوڑ دیا گیا۔ تاکہ اس طرح سب مسلمان ایک ہی وقت میں سحری کھائیں اور افطار کریں۔ اس حالت میں اگر کسی کا دل روزے کی طرف راغب نہ بھی ہو۔ تب بھی ماحول اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ روزے کی سعادت سے محروم نہ رہنے پائے۔ اس اجتماعی حکم کی بنا پر کمزور ایمان والے بھی ایمانی قوت کا سرمایہ حاصل کر سکتے ہیں اور عمل صالح کی کھیتیوں کو سرسبز و شاداب بنا سکتے ہیں۔

لیلۃ القدر رمضان کی چھٹی خصوصیت لیلۃ القدر ہے۔ اس رات کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے۔ سورہ قدر پ ۳۰۔ اس رات کو مندرجہ ذیل دعا پڑھنا مسنون ہے:۔

اللّٰھم انک عفوٌ تحبُّ العفوَ فاعفُ عنّی۔ ترمذی مشکوٰۃ ص ۱۸۲

اے اللہ تو معاف کرنے والا ہے۔ معافی کو پسند کرتا ہے۔ تو میری خطائیں معاف فرما۔

عام طور پر ستائیسویں شب ہی کو شب قدر سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کے آخری عشرے کی پانچ طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات شب قدر ہوتی ہے۔ اس لیے ان پانچ راتوں کو خاص طور پر عبادت و تلاوت اور ذکر الٰہی میں گزارنا چاہیئے۔

اعتکاف رمضان المبارک کی ساتویں خصوصیت اعتکاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ لیکن آخری سال آپؐ نے بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔ صحیح بخاری مشکوٰۃ ص ۱۸۳

اسلام نے رہبانیت (ترک دنیا) سے منع کیا۔ لیکن انسان کی یہ خواہش بھی فطری ہے کہ وہ یکسوئی کے ساتھ گوشۂ تنہائی میں اپنے رب سے سرگوشیوں میں مصروف ہو اور اس کے حضور میں گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگے اور آئندہ کے لیے از سر نو اطاعت و وفاداری کا عہد و پیمان باندھے، اعتکاف کو مستحب قرار دے کر اس خواہش کو پورا کیا گیا ہے۔

دُعا

رمضان المبارک کی آٹھویں خصوصیت دعا ہے۔ قرآن مجید میں رمضان المبارک کے احکام و فضائل کو بیان کرتے ہوئے درمیان میں دعا کا ذکر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :-

واذا سألکَ عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیؤمنوبی...
سورۃ بقرہ پ۲

یعنی جب میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں (توان سے کہہ دو۔ کہ) میں قریب ہوں۔ دعا کرنے والے کی پکار کو میں سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، لوگوں کو چاہیئے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ پہ ایمان لائیں ۔

قرآن مجید کا یہ اندازِ بیان ظاہر کر رہا ہے کہ رمضان اور دعا میں انتہائی گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ دعا کی مقبولیت کے بیشتر اوقات اس ماہ میں رکھے گئے ہیں ۔

رمضان ۔ عبادت کا مقدس، پاکیزہ اور پُر بہار موسم ہے اور دعا کے بارے میں ارشادِ نبویؐ ہے :۔

الدّعاءُ مُخّ العبادۃ ۔
ترمذی مشکوٰۃ ص۱۹۴ ج۱

دعا عبادت کا مغز اور گودا ہے ۔

اسی بنا پہ روزے دار کی دعا خصوصًا افطار کے وقت اللہ تعالٰی قبول فرماتا ہے۔

سلسلہ مطبوعات قرآن اکیڈمی نمبر ۱

اسلام کی نشأۃ ثانیہ
کرنے کا اصل کام

★ اسرار احمد

• فکر مغرب کا ہمہ گیر استیلاء • بنیادی نقطہ نظر • عالم اسلام پہ مغرب کی سیاسی و فکری یورش • مدافعت کی اوّلین کوششیں اور ان کا ماحصل • علوم عمرانی کا ارتقاء • اسلامی نظام حیات کا تصوّر اور بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں۔ • تعبیر کی کوتاہی • احیائے اسلام کی شرط لازم، تجدید ایمان • کرنے کا اصل کام اور عملی اقدامات

★ ۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ ، صفحات ۴۴ ۔ طباعت آفسٹ ۔ قیمت: پچاس پیسے

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور۔ ۱۲۔ افغانی روڈ۔ سمن آباد، لاہور

سلسلہ مطبوعات　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　قرآن اکیڈمی ۲

رمضان المبارک کا بہترین تحفہ

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبولِ عام تالیف

مُسلمانوں پر قُرآن مجید کے حقوق

خود پڑھیئے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفۃً پیش کیجئے

یہ رسالہ، جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے برادرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سلمہٗ نے ان حقوق و فرائض کی تشریح کے مقصد سے لکھا ہے جو ایک مسلمان پر قرآن سے متعلق عائد ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں قرآن پر ایمان کے مدعیوں کی کمی نہیں لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس ایمان کے تقاضے اور مطالبے کیا ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے قرآن کے دلائل کی روشنی میں ان تقاضوں اور مطالبوں کی تشریح کی ہے۔ اور بیک نظر محسوس ہوتا ہے کہ نہایت خوبی اور نہایت جامعیت کے ساتھ تشریح کی ہے۔ اندازِ بیان نہایت دلنشین۔ دلائل نہایت محکم اور اسلوبِ خطاب نہایت ہی مؤثر اور دردمندانہ ہے۔ ہر مسلمان جو قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح بنیاد پر قائم کرنا چاہتا ہے، اس رسالے میں بہترین رہنمائی پائے گا۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے قلم میں برکت دے کہ وہ ایسی بہت سی چیزیں لکھنے کی توفیق پائیں۔ ہماری بہت سی عزیز امیدیں ان سے وابستہ ہیں۔ —— (مولانا امین احسن اصلاحی)

★ سائز ۸/۲۲×۱۸، صفحات ۸۰، طباعت آفسٹ، سفید کاغذ اور خوشنما کور۔

ہدیہ :— صرف ایک روپیہ

(نوٹ) اس کتابچے کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کا ہدیہ ڈیڑھ روپیہ ہے

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۱۲- افغانی روڈ۔ سمن آباد۔ لاہور

تدبر قرآن
مولانا امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۃ ہود (۲)

آگے کا مضمون، آیات ۲۵ - ۹۹

آگے آیت ۹۹ تک ایک تاریخی ترتیب کے ساتھ پچھلے رسولوں اور ان کی قوموں کی سرگذشتیں سنائی گئی ہیں۔ ان کے سنانے سے مقصود ایک طرف تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دکھانا ہے کہ آج جو کچھ تمہیں پیش آرہا ہے بعینہٖ وہی کچھ تم سے پہلے آنے والے رسولوں کو بھی پیش آچکا ہے تو تم ان کی زندگیوں سے رہنمائی حاصل کرو اور جس طرح انہوں نے صبر و عزیمت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اسی طرح تم بھی حالات کا مقابلہ کرو۔ دوسری طرف قریش کو یہ دکھانا ہے کہ تم نے جو روش اپنے رسول کے ساتھ اختیار کی ہے وہی روش تمہاری پیشرو قوموں نے بھی اختیار کی تھی جس کے نتیجہ میں ایک خاص حد تک مہلت دیئے جانے کے بعد وہ ہلاک کر دی گئیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جس طرح کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا اسی طرح کا معاملہ وہ تمہارے ساتھ نہ کرے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

ترجمہ

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ اس نے ان کو آگاہ کیا کہ میں تمہارے لئے ایک نذیر مبین ہو کر آیا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ میں تم پر ایک دردناک دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اس کی قوم کے ان سربراہوں نے، جنہوں نے کفر کیا، جواب دیا کہ ہم تو تم کو بس اپنے ہی جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں اور ہم تمہاری پیروی کرنے والوں میں انہی کو پاتے ہیں جو ہمارے اندر کے ذلیل لوگ ہیں، بے سمجھے بوجھے تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں اور ہم تم لوگوں کے لئے اپنے مقابل میں کوئی خاص امتیاز بھی نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ ہم

تو تم کو بالکل جھوٹا خیال کر رہے ہیں۔ ۲۵-۲۷

اس نے کہا، اے میرے ہم قومو، بتاؤ اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور پھر اس نے خاص اپنی رحمت سے بھی مجھے نوازا اور وہ تم سے پوشیدہ رہی تو کیا ہم اس کو تم پر چپکا دیں جب کہ تم اس سے بیزار بھی ہو! اور اے میرے ہم قومو، میں اس خدمت پر تم سے کسی مال کا طالب نہیں۔ میرا اجر تو بس اللہ ہی کے ذمہ ہے اور میں ان لوگوں کو ہرگز دھتکارنے والا نہیں جو ایمان لائے ہیں۔ یہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں، بلکہ میں تو تم کو دیکھ رہا ہوں کہ تم جہالت میں مبتلا ہو۔ اور اے میرے ہم قومو، اگر میں ان کو دھتکار دوں تو خدا کے مقابل میں کون میری مدد کرے گا؟ کیا تم لوگ اس پہلو پر دھیان نہیں کرتے؟ اور میں تمہارے سامنے یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا اور نہ یہ دعویٰ کرتا کہ میں کوئی فرشتہ ہوں اور نہ میں ان لوگوں کے بارے میں، جن کو تمہاری نگاہیں حقیر دیکھتی ہیں، یہ کہہ سکتا کہ خدا ان کو کوئی خیر دے ہی نہیں سکتا۔ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کروں تو میں ہی ظالم ٹھہروں گا۔ وہ بولے کہ اے نوح تم نے ہم سے بحث کر لی اور بہت بحث کر لی، اگر تم سچے ہو تو وہ چیز ہم پر لاؤ جس کی تم ہم کو برابر دھمکی سنا رہے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ اس کو تو تم پر اللہ ہی لائے گا اگر وہ چاہے گا اور تم اس کے قابو سے باہر نہ نکل سکو گے۔ اور میری خیر خواہی تم پر کچھ کارگر نہیں ہو سکتی اگر میں تمہاری خیر خواہی کرنا چاہوں اگر اللہ تم کو گمراہ کرنا چاہتا ہو۔ وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹنا ہے۔ ۲۸-۳۴

کیا یہ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو گھڑ لیا ہے، کہہ دو کہ اگر میں نے اس کو گھڑا ہے تو میرے جرم کا وبال میرے ہی اوپر ہے اور جو جرم تم کر رہے ہو میں اس سے بری ہوں۔ ۳۵

اور نوح کو وحی کی گئی کہ تمہاری قوم میں سے جو ایمان لا چکے، ان کے سوا اب کوئی اور ایمان لانے والا نہیں تو جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس سے آزردہ خاطر نہ ہو اور تم کشتی بناؤ ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق اور ان ظالموں کے باب

ہیں اب ہم سے کچھ نہ کہیو، یہ تو غرق ہو کر رہیں گے اور وہ کشتی بنانے لگا۔ اور جب جب اس کی قوم کے بڑوں کی کوئی جماعت اس کے پاس سے گزرتی تو اس کا مذاق اڑاتی۔ وہ ان کو جواب دیتا کہ اگر تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو تو جس طرح تم مذاق اڑا رہے ہو اسی طرح ہم بھی تمہارا مذاق اڑائیں گے۔ تم جلد جان لو گے کہ وہ کون ہیں جن پر وہ عذاب آتا ہے جو ان کو رسوا کر کے رکھ دیتا ہے اور وہ قہر نازل ہوتا ہے جو ٹک کے رہ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آپہنچا اور طوفان ابل پڑا ہم نے اس کو کہا کہ ہر چیز میں سے نر و مادہ دونوں کو اور اپنے اہل و عیال کو، بجز ان کے جن پر حکم نازل ہو چکا ہے، اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، اس کشتی میں سوار کر لو، اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کی تعداد تو بس تھوڑی ہی تھی۔ اور اس نے کہا کہ اس میں سوار ہو جاؤ، اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا، میرا رب بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے ۳۶-۴۱

اور وہ کشتی پہاڑوں کی طرح اٹھتی موجوں کے درمیان ان کو لے کر چلنے لگی اور نوح نے اپنے بیٹے کو، جو اس سے الگ تھا، آواز دی کہ اے میرے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور ان کافروں کا ساتھ نہ دے۔ وہ بولا کہ میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھے پانی سے بچا لے گا۔ نوح نے کہا آج اللہ کے قہر سے کوئی بچانے والا نہیں ہے مگر وہی جس پر رحم فرمائے۔ اور ان دونوں کے درمیان موج حائل ہو گئی اور وہ بھی غرق ہونے والوں میں سے ہو کے رہا۔ اور حکم ہوا کہ اے زمین اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان تھم جا اور پانی اتار دیا گیا اور معاملے کا فیصلہ ہو گیا اور کشتی کوہ جودی پر جا لگی اور اعلان کر دیا گیا کہ ظالموں پر خدا کی پھٹکار ہے۔ اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے میرے خداوند میرا بیٹا تو میرے اہل میں سے ہے۔ اور تیرا وعدہ پکا ہے اور تو تمام فیصلہ کرنے والوں سے بڑھ کر فیصلہ کرنے والا ہے، فرمایا اے نوح وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے، وہ نہایت ناہنجار ہے۔ مجھ سے اس چیز کے لئے درخواست نہ کرو جس کے باب میں تمہیں کچھ علم نہیں اور میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں میں سے نہ بنو۔ اس نے کہا کہ اے میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ تجھ سے کسی ایسی چیز کی درخواست کروں جس کے باب میں مجھے کوئی علم نہیں اور اگر

تو میری مغفرت نہ کرے گا اور مجھ پر رحم نہ فرمائے گا تو میں نامرادوں میں سے ہو جاؤں گا۔ ارشاد ہوا اے نوح اترو، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ اپنے اوپر بھی اور ان امتوں پر بھی جو ان سے ظہور میں آئیں گی جو تمہارے ساتھ ہیں۔ اور ایسی امتیں بھی اٹھیں گی جن کو ہم بہرہ مند کریں گے پھر ان کو ہماری طرف سے ایک عذاب دردناک پکڑے گا۔ ۴۲-۴۸

یہ ماجرا غیب کی باتوں میں سے ہے جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ سنا رہے ہیں، اس سے پہلے نہ تم ہی اس کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم کے لوگ ہی تو ثابت قدم رہو، انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کا حصہ ہے۔ ۴۹

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو رسول بنا کر بھیجا۔ اس نے ان کو دعوت دی کہ اے میری قوم کے لوگو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ یہ تم محض افترا کر رہے ہو۔ اے میری قوم کے لوگو، میں اس پر تم سے کسی معاوضے کا طالب نہیں۔ میرا اجر تو بس اسی کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے تو کیا تم سمجھتے نہیں؟ اور اے میری قوم کے لوگو، اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو پھر اس کی طرف رجوع کرو وہ تم پر خوب خوب اپنا ابر کرم برسائے گا اور تمہاری قوم میں اضافہ پر اضافہ فرمائے گا اور مجرمانہ روگردانی کی روش اختیار نہ کرو۔ وہ بولے کہ اے ہود تم ہمارے پاس کوئی کھلی نشانی لے کر تو آئے نہیں اور ہم مجرد تمہارے کہنے سے تو اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور ہم ہرگز تمہیں ماننے والے نہیں۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ تم پر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑی ہے۔ اس نے کہا میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ اس کے سوا تم جن کو شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے بالکل بری ہوں۔ تو تم سب مل کر میرے خلاف اپنی چالیں چل دیکھو، پھر مجھے ذرا مہلت نہ دو۔ میں نے اللہ، اپنے اور تمہارے رب پر، بھروسہ کیا۔ جتنے بھی جاندار ہیں ان کی پیشانی اسی کی گرفت میں ہے۔ بے شک میرا رب نہایت سیدھی راہ پر ہے۔ پس اگر تم اعراض کر رہے ہو تو میں نے تمہیں وہ پیغام پہنچا دیا جو دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا ہے۔ اور میرا رب تمہاری جگہ اب تمہارے سوا کسی اور قوم کو لائے گا اور تم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے۔ میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔ اور

جب ہمارا عذاب آ دھمکا ہم نے ہود کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے اپنے فضل خاص سے نجات بخشی اور ہم نے ان کو ایک نہایت ہی سخت عذاب سے بچایا۔ ۵۰ - ۵۸

اور یہ قوم عاد ہے انہوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر جبار و سرکش کی بات کے پیچھے لگے اور اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے روز بھی۔ سن لو کہ عاد نے اپنے رب کا انکار کیا۔ سن لو کہ ہلاکی ہو ہود کی قوم عاد کے لئے!! ۵۹ - ۶۰

اور قوم ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو رسول بنا کر بھیجا اس نے دعوت دی اے میری قوم کے لوگو اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، اسی نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اس میں آباد کیا تو اس سے مغفرت مانگو پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ میرا رب قریب بھی ہے، قبول کرنے والا بھی۔ وہ بولے کہ صالح، اس سے پہلے تو ہمارے اندر تم بڑی امیدوں کے مرکز تھے۔ کیا تم ہمیں ان کی عبادت سے روکتے ہو جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے! اور ہم تو اس چیز کے سبب سے جس کی تم ہمیں دعوت دے رہے ہو بڑی ہی سخت الجھن میں پڑ گئے ہیں، اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے اپنی جانب سے رحمت خاص سے بھی مجھے نوازا تو اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو اللہ کی پکڑ کے وقت کون میرا مددگار ہوگا۔ سو تم تو میری بربادی ہی میں اضافہ کرو گے۔ ۶۱ - ۶۳

اور اے میری قوم کے لوگو، یہ اللہ کی اونٹنی ہے، تمہارے لئے ایک نشانی تو اس کو چھوڑو کہ یہ اللہ کی زمین میں چرے چگے اور اس کو کوئی گزند نہ پہنچاؤ ورنہ ایک قریبی عذاب تمہیں آ پکڑے گا۔ تو انہوں نے اس کی کوچیں کاٹ دیں تب اس نے کہا کہ اب تین دن اور اپنی بستی میں رس لیں لو، یہ دھمکی جھوٹی نہیں ہونے کی پس جب ہمارا حکم صادر ہوا تو ہم نے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے اپنے خاص فضل سے اس عذاب اور اس دن کی رسوائی سے نجات بخشی، بے شک تمہارا رب ہی قوی اور غالب ہے۔ اور ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا خدا

تو میری مغفرت نہ کرے گا اور مجھ پر رحم نہ فرمائے گا تو میں نامرادوں میں سے ہو جاؤں گا۔ ارشاد ہوا اے نوح اترو، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ اپنے اوپر بھی اور ان امتوں پر بھی جو ان سے ظہور میں آئیں گی جو تمہارے ساتھ ہیں۔ اور ایسی امتیں بھی اٹھیں گی جن کو ہم بہرہ مند کریں گے پھر ان کو ہماری طرف سے ایک عذاب دردناک پکڑے گا۔ ۴۲-۴۸

یہ ماجرا غیب کی باتوں میں سے ہے جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ سنا رہے ہیں، اس سے پہلے نہ تم ہی اس کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم کے لوگ ہی تو ثابت قدم رہو، انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کا حصہ ہے۔ ۴۹

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو رسول بنا کر بھیجا۔ اس نے ان کو دعوت دی کہ اے میری قوم کے لوگو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ یہ تم محض افترا کر رہے ہو۔ اے میری قوم کے لوگو، میں اس پر تم سے کسی معاوضہ کا طالب نہیں۔ میرا اجر تو بس اسی کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے تو کیا تم سمجھتے نہیں؟ اور اے میری قوم کے لوگو، اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو پھر اس کی طرف رجوع کرو وہ تم پر خوب خوب اپنا ابر کرم برسائے گا اور تمہاری قوت میں اضافہ پر اضافہ فرمائے گا اور مجرمانہ روگردانی کی روش اختیار نہ کرو۔ وہ بولے کہ اے ہود تم ہمارے پاس کوئی کھلی نشانی لے کر تو آئے نہیں اور ہم محض تمہارے کہنے سے تو اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور ہم ہرگز تمہیں ماننے والے نہیں۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ تم پر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑی ہے۔ اس نے کہا میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ اس کے سوا تم جن کو شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے بالکل بری ہوں۔ تو تم سب مل کر میرے خلاف اپنی چالیں چل دیکھو، پھر مجھے ذرا مہلت نہ دو۔ میں نے اللہ، اپنے اور تمہارے رب پر بھروسہ کیا۔ جتنے بھی جاندار ہیں ان کی پیشانی اسی کی گرفت میں ہے۔ بے شک میرا رب نہایت سیدھی راہ پر ہے۔ پس اگر تم اعراض کر رہے ہو تو میں نے تمہیں وہ پیغام پہنچا دیا جو دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا ہے۔ اور میرا رب تمہاری جگہ اب تمہارے سوا کسی اور قوم کو لائے گا اور تم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے۔ میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔ اور

جب ہمارا عذاب آ دھمکا ہم نے ہود کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے اپنے فضل خاص سے نجات بخشی اور ہم نے ان کو ایک نہایت ہی سخت عذاب سے بچایا۔ ۵۰ - ۵۸

اور یہ قوم عاد ہے انہوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر جبار و سرکش کی بات کے پیچھے لگے اور اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے روز بھی۔ سن لو کہ عاد نے اپنے رب کا انکار کیا۔ سن لو کہ ہلاکی ہو ہود کی قوم عاد کے لئے!! ۵۹ - ۶۰

اور قوم ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو رسول بنا کر بھیجا اس نے دعوت دی اے میری قوم کے لوگو اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، اسی نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اس میں آباد کیا تو اس سے مغفرت مانگو پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ میرا رب قریب بھی ہے، قبول کرنے والا بھی۔ وہ بولے کہ صالح، اس سے پہلے تو ہمارے اندر تم بڑی امیدوں کے مرکز تھے۔ کیا تم ہمیں ان کی عبادت سے روکتے ہو جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے! اور ہم تو اس چیز کے سبب سے جس کی تم ہمیں دعوت دے رہے ہو بڑی ہی سخت الجھن میں پڑ گئے ہیں، اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے اپنی جانب سے رحمت خاص سے بھی مجھے نوازا تو اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو اللہ کی پکڑ کے وقت کون میرا مددگار ہوگا۔ سو تم تو میری بربادی ہی میں اضافہ کرو گے۔ ۶۱ - ۶۳

اور اے میری قوم کے لوگو، یہ اللہ کی اونٹنی ہے، تمہارے لئے ایک نشانی تو اس کو چھوڑو کہ یہ اللہ کی زمین میں چرے چگے اور اس کو کوئی گزند نہ پہنچاؤ ورنہ ایک قریبی عذاب تمہیں آ پکڑے گا۔ تو انہوں نے اس کی کوچیں کاٹ دیں تب اس نے کہا کہ اب تین دن اور اپنی بستی میں رس لیں لو، یہ دھمکی جھوٹی نہیں ہونے کی پس جب ہمارا حکم صادر ہوا تو ہم نے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے اپنے خاص فضل سے اس عذاب اور اس دن کی رسوائی سے نجات بخشی، بے شک تمہارا رب ہی قوی اور غالب ہے۔ اور ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا خدا

کی ڈانٹ نے آپکڑا اور وہ اپنے گھروں میں زمین سے چھٹے پڑے رہ گئے گویا کہ کبھی ان میں بسے ہی نہیں۔ سن لو کہ ثمود نے اپنے رب کی ناشکری کی۔ سن لو کہ ہلاکی ہو ثمود کے لئے !! ۶۴-۶۸

اور ابراہیم کے پاس ہمارے فرستادے خوشخبری لے کر آئے۔ کہا سلامتی ہو اس نے بھی کہا سلامتی ہو۔ دیر نہیں گزری کہ اس نے ان کے آگے بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا۔ پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں تو اس نے ان میں اجنبیت پائی اور ان کی طرف سے ایک خدشہ محسوس کیا وہ بولے کہ تم کوئی اندیشہ نہ کرو، ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں اور اس کی بیوی پاس کھڑی تھی۔ وہ ہنسی پس ہم نے اس کو اسحاق کی خوشخبری دی اور اسحاق کے آگے یعقوب کی۔ وہ بولی کہ ہائے شامت ! کیا اب میں بچہ جنوں گی جب میں خود بھی ایک بڑھیا ہوں اور یہ میرے شوہر بھی بوڑھے ہیں ! یہ تو ایک نہایت ہی عجیب بات ہوگی ! وہ بولے کیا خدا کی بات پر تعجب ! اللہ کی رحمت اور برکتیں نازل ہوں آپ پر اے اہل بیت نبی۔ بے شک وہ سزاوار محمد و بزرگ ہے !! ۶۹-۷۳

تو جب ابراہیم کا خوف دور ہوا اور اس کو بشارت ملی تو وہ ہم سے قوم لوط کے بارے میں بحث کرنے لگا۔ بے شک ابراہیم نہایت ہی بردبار، دردمند اور اپنے رب کی طرف دھیان رکھنے والا تھا۔ اے ابراہیم یہ بحث چھوڑو، اب تمہارے رب کا حکم ہو چکا ہے اور ان پر ایک ایسا عذاب آنے والا ہے جو ٹالے نہ ٹالا جا سکے گا۔ اور جب ہمارے فرستادے لوط کے پاس پہنچے وہ ان کے سبب سے غمگین ہوا اور اس کا دل بھنچا اور بولا کہ یہ تو بہت ہی کٹھن دن ہے !! ۷۴-۷۷

اور اس کی قوم کے لوگ جھپٹتے ہوئے اس کے پاس پہنچے اور یہ پہلے سے بدکاریوں میں مبتلا تھے۔ اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو، یہ میری بیٹیاں ہیں وہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ ہیں تو اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے باب میں مجھے رسوا نہ کرو، کیا تم میں کوئی مرد معقول نہیں ! وہ بولے کہ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ تمہاری بیٹیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں اور تم خوب جانتے ہو جو کچھ ہم چاہتے ہیں۔ اس نے کہا کاش میرے پاس تم سے مقابلہ کی قوت ہوتی یا میں کسی طاقتور سہارے کی پناہ لے سکتا !! فرستادوں نے کہا،

اے لوط ہم تو تمہارے رب کے فرستادے ہیں۔ یہ ہرگز تم تک نہیں پہنچ سکتے۔ تو تم اپنے اہل و عیال کو لے کر کچھ رات رہے نکل جاؤ اور تم میں سے کوئی مڑ کے بھی نہ دیکھے مگر تمہاری بیوی اس سے مستثنیٰ ہے اس پر بھی وہی آفت آنی ہے جو ان پر مقدر ہو چکی ہے۔ ان کے عذاب کا وقت مقررہ صبح ہے، کیا صبح قریب نہیں! ۸۱-۷۸

پس جب آیا ہمارا عذاب تو ہم نے اس بستی کو یک قلم تلپٹ کر کے رکھ دیا اور اس پر سنگ گِل کی بارش کی، تہ بہ تہ، تمہارے رب کے پاس نشان لگائے ہوئے، اور وہ ان ظالموں سے کچھ دُور نہیں۔ ۸۲-۸۳

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے دعوت دی کہ اے میری قوم کے لوگو اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو۔ میں تمہیں فارغ البالی کی حالت میں دیکھ رہا ہوں اور تم پر ایک گھیرنے والے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اور اے میری قوم کے لوگو، ناپ اور تول کو پورا رکھو پورے عدل کے ساتھ اور لوگوں کی چیزوں میں ان کی حق تلفی نہ کرو اور زمین میں فساد پھیلانے والے بن کر نہ ابھرو۔ اللہ کا بخشا ہوا منافع ہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سچے ایمان والے ہو اور میں تم پر نگران نہیں ہوں۔ وہ بولے کہ اے شعیب، کیا تمہاری نماز تمہیں یہی سکھاتی ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ بیٹھیں جن کی ہمارے باپ دادا پرستش کرتے آئے یا یہ کہ ہم اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں؟ بس تمہیں تو ایک دانشمند اور راست رو رہ گئے ہو! اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو، بتاؤ اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مزید اپنی جانب سے مجھے رزق حسن سے بھی نوازا (تو اس کے سوا میں تمہیں اور کس چیز کی دعوت دوں) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہاری مخالفت کر کے وہی چیز خود اختیار کروں جس سے تمہیں روک رہا ہوں۔ میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں جس حد تک کر سکوں اور مجھے توفیق تو اللہ ہی کی مدد سے حاصل ہو گی۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ اور اے میری قوم کہیں میری ضد تمہارے لئے اس امر کا باعث نہ بن جائے کہ تم پر بھی اسی طرح کی آفت نازل ہو جس طرح کی آفت قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح پر نازل ہوئی اور قوم لوط تو تم سے کچھ دور بھی نہیں اور اپنے رب سے مغفرت مانگو

پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ بے شک میرا رب نہایت مہربان اور بڑی محبت کرنے والا ہے۔ وہ بولے کہ اے شعیب، جو باتیں تم کہتے ہو اس کا بہت سا حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا ہے اور ہم تو تم کو اپنے اندر ایک کمزور وجود خیال کرتے ہیں۔ اور اگر تمہارا خاندان نہ ہوتا تو ہم تو تم کو سنگسار کر دیتے اور تم ہم پر کچھ ایسے بھاری نہیں۔ اس نے کہا اے میری قوم، کیا میرا خاندان تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے اور اس کو تو تم نے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ میرا رب جو کچھ تم کر رہے ہو سب کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اے میری قوم کے لوگو تم اپنے طور پر کرو جو کر رہے ہو۔ میں بھی اپنے طور پر کر رہا ہوں، تم عنقریب جان لوگے کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اس کو رسوا کر کے رکھ دیتا ہے اور کون ہے جو جھوٹا ہے اور انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔ اور جب ہمارا عذاب آیا ہم نے شعیب کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے اپنی رحمت سے نجات دی اور جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ان کو ڈانٹ نے آپکڑا پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے گویا کبھی ان میں بسے ہی نہیں تھے۔ ہاں ہلاک ہوئے مدین جس طرح دفع ہوئے ثمود!! ۸۴-۹۵

اور ہم نے موسیٰ کو فرعون اور اس کے اعیان کے پاس اپنی آیات اور ایک روشن نشانی کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا تو انہوں نے فرعون ہی کی بات مانی حالانکہ فرعون کی بات راست نہ تھی۔ وہ قیامت کے روز اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور ان کو دوزخ میں لے جا اتارے گا اور کیا ہی برا گھاٹ ہوگا جس پر یہ اتریں گے۔ اور اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی۔ کیا ہی برا انعام ہے جو دیا گیا ہے! ۹۶-۹۹

۳- الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

'ولقد ارسلنا ... نذیر مبین' حضرت نوحؑ کی سرگذشت کی طرف اجمالی اشارہ پچھلی سورہ میں بھی (آیات ۷۱-۷۳) میں گزر چکا ہے۔ اس سورہ میں اس اجمال کی تفصیل آ رہی ہے۔ 'نذیر مبین' (کھلا ہوا ڈرانے والا) میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ رسول جس قہر و عذاب سے ڈراتا ہے اس کی نوعیت قیاسات اور اندازوں پر مبنی اشارات و کنایات

کی نہیں ہوتی بلکہ ایک واضح اور قطعی خبر اور اعلان کی ہوتی ہے اس لئے کہ اس کی بنیاد اوّل تو وحی الٰہی پر ہوتی ہے ثانیاً یہ اس سنت الٰہی کا تقاضا بھی ہے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً ظاہر ہوتی ہے۔ اس قطعیت کا اثر قدرتی طور پر اس کے الفاظ اور لب و لہجہ میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ وہ آنے والے خطرے کا اس طرح اعلان کرتا ہے گویا اپنی دونوں آنکھوں سے اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہاں لفظ "مبین" میں ایک لطیف تلمیح بھی ہے، اس کو بھی نگاہ میں رکھیے۔ عرب میں دستور رہا ہے کہ ہر قوم کے لوگ کسی بلند ٹیلہ یا پہاڑی پر دیدبان بناتے جہاں ہر وقت ایک نگران مقرر رہتا جس کا کام یہ ہوتا کہ جب وہ دیکھتا کہ کسی طرف سے حملہ آوروں کی کوئی جماعت اس کی قوم پر حملہ کیا چاہتی ہے تو وہ اپنے کپڑے پھاڑ کر ننگا ہو جاتا اور "واصباحا!" کا نعرہ لگاتا۔ یہ پوری قوم کے لئے "رم ہوتا اور سب تلواریں سونت سونت کر مدافعت کے لئے باہر نکل آتے۔ اس کو "نذیر عریان" کہتے تھے۔ خدا کے رسول بھی اپنی قوم کو آنے والے عذاب سے آگاہ کرنے کے لئے آئے اور انہوں نے بالکل اس طرح لوگوں کو اس سے آگاہ کیا گویا وہ عقب سے نمودار ہی ہونے والا ہے۔ اس وجہ سے قرآن میں ان کے لئے "نذیر مبین" کے الفاظ استعمال ہوئے۔

حضرت نوحؑ کی دعوت

"ان لا تعبدوا الا اللہ .... یوم الیم" یہ حضرت نوحؑ کی دعوت کا لفظ آغاز ہے۔ پیچھے مڑ کر اس سورہ کی آیت ۳ پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ بعینہٖ اسی لفظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی دعوت کا آغاز فرمایا۔ پھر مزید آگے بڑھیے تو معلوم ہوگا کہ جس قسم کا معارضہ قوم نوحؑ نے حضرت نوحؑ کے ساتھ کیا اسی قسم کا معارضہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم نے آپ کے ساتھ کیا۔ حالات و واقعات کی یہ مطابقت ہی ہے جس کو دکھانے کے لئے یہ سرگذشتیں سنائی جا رہی ہیں کہ نبی اور اس کی قوم دونوں کے سامنے ماضی کے آئینے میں ان کے حاضر اور مستقبل کا پورا نقشہ آ جائے۔ تاریخ کی جو قدر و قیمت ہے وہ اسی پہلو سے ہے۔ اگر یہ پہلو نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو تاریخ کی حیثیت مجرد داستان سرائی کی رہ جاتی ہے۔

قوم نوحؑ کے تین معارضے

"فقال الملاء الذین کفروا .... بل نظنکم کٰذبین" لفظ "ملاء" کی تحقیق ہم دوسرے مقام میں بیان کر چکے ہیں کہ اس سے مراد کسی قوم کے لیڈر، سرپنچ، زعما اور اکابر ہوتے ہیں۔ چونکہ بگڑی ہوئی قوم کے سارے فساد کی جڑ یہی ہوتے ہیں اس وجہ سے انبیاء کی دعوت اصلاح سے سب سے زیادہ پرخاش انہی کو رہی ہے۔ قوم نوحؑ کے ان لیڈروں نے حضرت نوحؑ کی دعوت کے جواب میں بیک وقت تین معارضے پیش کئے۔

ایک یہ کہ 'ما نراک الا بشرا مثلنا' یعنی تم تو ہمارے ہی جیسے انسان ہو۔ اگر خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہی تھا تو وہ کسی فرشتے کو یا کسی اور برتر مخلوق کو رسول بنا کر بھیجتا۔ یا کم از کم یہ کہ کسی فرشتے کو تمہارے ساتھ گواہ بنا کر بھیجتا۔ ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو ہماری طرف رسول بنا کر بھیجنے کے کیا معنی؟ پیچھے مڑ کر آیت ۱۲ پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجیے۔ بعینہٖ یہی بات قریش کے لیڈروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے جواب میں کہی۔

دوسرا یہ کہ 'وما نراک اتبعک الا الذین ھم اراذلنا بادی الرای' یعنی تمہارے پیرو ہمارے اندر کے صرف وہ لوگ بنے ہیں جو رذالے اور ادنیٰ درجہ کے لوگ ہیں، جن کی سوسائٹی میں کوئی عزت و وقعت نہیں، جو معاملات پر غور کرنے اور ان کے نتائج و عواقب کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ بس تمہاری بات انہوں نے سنی اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے لگ گئے 'بادی الرای' کو کشاف نے ظرف کے مفہوم میں لیا ہے اور اس کی وضاحت یوں کی ہے 'وقت حدوث اول رایھم' یعنی جو بات دل میں بادل وہلہ آگئی وہ کر گزرے، اس پر غور کرنے کی زحمت انہوں نے نہیں اٹھائی۔

تیسرا یہ کہ 'وما نری لکم علینا من فضل' یعنی اگر تم خدا کے ایسے ہی چہیتے ہو کہ اس نے تم کو رسول بنا کر بھیجا تو چاہیئے تو یہ تھا کہ تم پر اور تمہارے ساتھیوں پر من برستا، تم خزانوں کے مالک ہوتے اور خدم و حشم تمہارے ہم رکاب چلتے۔ لیکن ہم تو اپنے مقابل میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو کسی پہلو سے مرجح نہیں دیکھتے بلکہ اس کے برعکس یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا حال تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے مقابل میں بدرجہا بہتر ہے۔ اس وجہ سے ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹ موٹ کی ہم پر دھونس جما رہے ہو۔

'قال یقوم ارءیتم ... انلزمکموھا وانتم لھا کارھون' اب اس آیت میں اور آگے کی آیات میں مذکورہ بالا معارضات میں سے ایک ایک کا جواب آ رہا ہے۔ *(حاشیہ: معارضات کا جواب)*

حضرت نوحؑ نے پہلی بات تو یہ فرمائی کہ میں جو کچھ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اس کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک تو اس نور فطرت (بینۃ) پر جو میرے اندر پہلے سے موجود تھا۔ اور دوسرے اس وحی الٰہی (رحمت) پر جس سے میرے رب نے مجھے نوازا۔ اگر تمہارے اندر بھی فطرت کی وہ روشنی موجود ہوتی جو میرے اندر ہے تب تو میری یہ دعوت تمہیں خود اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی اور تم اس کو اللہ کی رحمت سمجھ کر قبول کرتے لیکن مشکل یہ ہے کہ تم نے اپنی ناشکریوں اور بداعمالیوں سے اپنی فطرت کے نور کو گل کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ قدرت کے قانون

کے تحت تمہارے دل تاریک کر دیئے گئے ہیں اور ان کے اندر کسی ہدایت کو قبول کرنے کی صلاحیت سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی ہے۔ اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں تمہارے اوپر ایک ایسی چیز چپکا دوں جس کے چکھنے کے لئے تمہارے اندر سرے سے کوئی لوث باقی ہی نہیں رہ گیا ہے اور وہ بھی اس حال میں کہ تم اس کے نام سے بھی بیزار ہو۔ پیچھے آیت ۱۷ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں، ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجئے۔

' ویقوم لا اسئلکم علیہ مالاً .... ولکنی ارٰکم قوما تجہلون' یہ حضرت نوحؑ کی طرف سے اپنی قوم کے سرداروں کی نخوت کا جواب ہے کہ اگر تم میری بات سننے اور سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہو تو اچھی طرح سمجھ لو کہ اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ہے، سرتاسر تمہارا اپنا ہی نقصان ہے۔ میں جو کچھ تمہارے آگے پیش کر رہا ہوں اگر میں اس کے عوض میں تم سے کسی اجرت کا طالب ہوتا تب تو تمہاری اس بیزاری کی مجھے پروا ہوتی کہ تم نے میرے مال کی قدر نہیں کی اور میری دکان بیٹھ جائے گی۔ لیکن جب میں کوئی تجارت نہیں کر رہا ہوں بلکہ جس طرح مفت پایا ہے اسی طرح مفت بانٹ رہا ہوں تو تم اگر اس کو قبول نہ کرو گے تو خود ہی خسارہ میں رہو گے۔ مجھے تو اس کا جو اجر ملنا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور وہ مجھے مل کے رہے گا۔ تمہارے ردّ و قبول سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ میری دعوت جن لوگوں نے قبول کی وہ تمہاری نگاہوں میں حقیر و رذیل لوگ ہیں، اس وجہ سے تمہیں میرے قرب سے عار ہے تو میں تمہاری دلداری کے لئے ان کو اپنے پاس سے دھتکارنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ وہ اپنے رب پر ایمان لائے ہیں اور کل کو اپنے اسی ایمان کے ساتھ اپنے رب سے ملنے والے ہیں۔ اگر میں آج انہیں تمہاری خاطر داری میں اپنے پاس سے دھتکار دوں تو کل کو میں خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ شرافت اور رذالت کا اصلی فیصلہ تو خدا کے ہاں ہونا ہے، وہی بتائے گا کہ اس کی نگاہوں میں کون شریف ہے اور کون رذیل۔ میری نگاہوں میں تو تمہی لوگ جہالت میں مبتلا ہو۔

' ویقوم من ینصرنی ... افلا تذکرون' یہ اوپر والی آیت کی مزید وضاحت ہے کہ اگر میں تمہاری ناز برداری میں اللہ پر ایمان لانے والے غریبوں کو دھتکاروں تو کل کو خدا کی پکڑ سے مجھے کون بچانے والا بنے گا۔ ' افلا تذکرون' یعنی مال و جاہ کے غرور میں تم ایسے پاگل ہو گئے ہو کہ تم میں سے کسی کو معاملے کے اس پہلو پر غور کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔

'ولا اقول لکم .... انی اذاً لمن الظلمین' یہ مخالفین کے سارے معارضات کا اکٹھا

جواب ہے کہ اگر تم مجھ میں کوئی بات ما فوق بشریت نہیں پاتے تو میں نے بشریت سے بالاتر ہونے کا دعویٰ کب کیا ہے؟ میں نے کب کہا ہے کہ میرے پاس خدا کے خزانوں کی کنجیاں ہیں یا میں غیب دان ہوں یا کوئی فرشتہ ہوں؟ میں ان باتوں میں سے کسی بات کا بھی مدعی نہیں ہوں۔ میں تو صرف خدا کا رسول ہوں اور جس پیغام کے ساتھ اس نے مجھے تمہاری طرف بھیجا ہے وہ میں تمہیں سنا رہا ہوں۔ میرے ساتھی غریب و نادار لوگ ہیں اس وجہ سے تم ان کو حقیر سمجھتے ہو اور چونکہ تمہاری نگاہوں میں ساری قدر و قیمت دنیا اور اسباب دنیا کی ہی ہے جو تمہیں حاصل ہے، انہیں حاصل نہیں ہے، اس وجہ سے تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر اس دعوت میں، جو میں دے رہا ہوں، کوئی پہلو خیر کا ہوتا تو بھلا یہ کس طرح ممکن تھا کہ یہ سدا کے ننگے بھوکے لوگ تو اس سے فیض یاب ہو جاتے اور تم جو اپنے زعم میں سارے خیر و فضل کے وارث و مورث ہو اس سے محروم رہ جاتے! اگر تمہارا گھمنڈ یہ ہے کہ جب انہیں دنیا نہیں ملی تو خدا ان کو کوئی اور خیر و فضل کس طرح دے سکتا ہے تو میں تمہارے اس گھمنڈ کی تائید کرنے کے لئے تیار نہیں۔ دنیا تو ہر اہل و نااہل کو مل جاتی ہے لیکن دین کی نعمت ہمیشہ انہی کو نصیب ہوتی ہے جن کے دلوں میں اس کے لئے صلاحیت ہوتی ہے اور جن کی فطرت مسخ ہونے سے محفوظ ہوتی ہے۔ یہ دل اور فطرت کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس وجہ سے اگر میں اس کے باب میں تمہارے گمان کی تائید کروں تو میں بھی اپنے آپ کو ظالموں کا ساتھی بنا لوں گا۔

قوم نوحؑ کا مطالبہ عذاب

'قالوا ینوح ... وما انتم بمعجزین' جب قوم نوحؑ کے اعیان بحث و مناظرہ کے میدان میں بالکل پسپا ہو گئے، حضرت نوحؑ نے ہر پہلو سے ان پر حجت تمام کر دی اور ان کے لئے کوئی راہ فرار باقی نہیں چھوڑی تو آخری مامن انہوں نے اپنے لئے یہ خیال کیا کہ ان سے اس عذاب کے لانے کا مطالبہ کریں جس کی وہ خبر دے رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ بحث و مناظرہ تو اے نوح! بہت ہو چکا۔ اب تو بس اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب لاؤ جس کی دھمکی پہ دھمکی سنا رہے ہو۔ حضرت نوحؑ نے جواب میں فرمایا کہ عذاب کا لانا تو اللہ کے اختیار میں ہے وہی جب چاہے گا لائے گا لیکن یہ یاد رکھو کہ اس طنطنہ کے ساتھ جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو جب عذاب آ دھمکے گا اس وقت کوئی خدا کے قابو سے باہر نہ نکل سکے گا۔

حضرت نوحؑ کا جواب

'ولا ینفعکم نصحی ... والیہ ترجعون' دعوت و نصیحت اور تذکیر و موعظت کا آخری مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ رسول اپنا فرض ادا کر کے اپنی سبکدوشی کا اعلان کرتا ہے اور اپنے جھٹلانے والوں کو ان کے اس انجام کے حوالہ کرتا ہے جو ان کے لئے خدا کی طرف سے مقدر ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ بات حضرت نوحؑ نے اسی مرحلہ میں فرمائی ہے کہ اب تم خدا کے قانون کی زد میں آ چکے ہو اور اپنے اعمال کے سبب سے

سزاوار ہو کہ خدا تمہیں گمراہی کی راہ پر جانے کے لئے چھوڑ دے تو میں لاکھ تمہیں نصیحت و موعظت سناؤں میری نصیحت و موعظت کچھ کارگر نہیں ہو سکتی اب تمہارا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے، وہی تمہارا رب ہے اور اسی کے آگے تمہاری پیشی ہونی ہے۔

حضرت نوحؑ کا اعلان برأت

'ام یقولون افتراہ ... وانا بری مما تجرمون' اس آیت میں بعض لوگوں نے مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھا ہے اور اس کو حضرت نوحؑ کی سرگذشت کے درمیان ایک التفات کی حیثیت دی ہے۔ اگرچہ اس کے التفات ہونے کا بھی ایک محل ہے لیکن ہمارے نزدیک' جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ دعوت و موعظت کے آخری مرحلہ میں اعلان براءت کی آیت ہے۔ اس آیت میں حضرت نوحؑ کو ہدایت ہوئی کہ اگر تمہاری قوم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جو کچھ تم انہیں بتا رہے ہو یہ سب تمہاری اپنی ہی گھڑی ہوئی باتیں ہیں جن کو تم جھوٹ موٹ خدا کی طرف منسوب کر رہے ہو تو اب یہ بحث بند کر دو اور ان سے کہہ دو کہ اگر یہ سب کچھ میرا افترا ہے تو اس جرم کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور اگر یہ حق ہے اور تم جان بوجھ کر اس سے بغاوت کر رہے ہو تو میں تمہارے اس جرم کی ذمہ داری سے اپنی براءت کا اعلان کرتا ہوں ——— ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ پیغمبر کے اعلان براءت کے بعد قوم کے لئے فیصلہ کن گھڑی آجاتی ہے۔

عذاب الٰہی کا ظہور

'واوحی الیٰ نوح ... انھم مغرقون' مذکورہ بالا اعلان براءت کے بعد حضرت نوحؑ کو وحی کے ذریعہ سے اطلاع دے دی گئی کہ تمہاری قوم میں جن لوگوں کے اندر تمہاری دعوت ایمان قبول کرنے کی صلاحیت تھی وہ ایمان لا چکے، اب کوئی اور ایمان لانے والا باقی نہیں رہا ہے۔ دودھ میں جتنا مکھن تھا وہ سب نکالا جا چکا ہے' اب جو بچ رہا ہے وہ صرف چھاچھ ہے۔ تو تم خاطر جمع رکھو۔ یہ جو کچھ اب تک کرتے رہے ہیں اس سے دل شکستہ اور ملول نہ ہو۔ اب سنت الٰہی کے مطابق ان کے لئے خدا کی عدالت کے ظہور کا وقت آگیا ہے اور فیصلہ الٰہی یہ ہے کہ یہ سب غرق کر دیئے جائیں گے تو تم اپنے اور اپنے اہل ایمان ساتھیوں کے بچاؤ کے لئے ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایات کے تحت ایک کشتی بناؤ اور خبردار ان ظالموں کے باب میں اب ہم سے کچھ نہ کہیو، اب یہ لازماً غرق ہو کے رہیں گے۔

'ویصنع الفلک ... فانا نسخر منکم کما تسخرون'. 'ویصنع الفلک' یعنی 'جعل یصنع الفلک' عربی زبان کے معروف اسلوب کے مطابق مضارع سے پہلے فعل ناقص حذف ہو گیا ہے۔

قوم نوح کی پھبتیاں

حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق کشتی بنانی شروع کر دی۔ ان کی قوم کے متکبرین جو عذاب کی دھمکی ہی کو سرے سے نعوذ باللہ لاف زنی سمجھتے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ عذاب سے بچاؤ کے لئے کشتی بھی بننی شروع ہو گئی ہے تو ظاہر ہے کہ انہوں نے اس کو خلل دماغ ہی پر محمول کیا ہوگا اور جب جب پاس سے گزرتے رہے ہوں گے خوب خوب پھبتیاں چست کرتے رہے ہوں گے اور کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان پھبتیوں کا حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کے دلوں پر کیا اثر پڑتا رہا ہوگا۔ لیکن انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو اس طرح کے امتحانات سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس غیب سے وہ لوگوں کو ڈراتے ہیں ان کو اس پر کس درجے کا یقین ہوتا ہے گویا وہ اس کو اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اگرچہ اپنے مخالفوں کو اس کو دکھا نہیں سکتے۔

ایک خاص اسلوب بیان

' فانا نسخر منکم کما تسخرون ' سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہم بھی اسی طرح کی مبتذل پھبتیاں تم پر چست کریں گے جس طرح کی پھبتیاں تم چست کر رہے ہو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ آج جس طرح ہمارا یہ فعل تمہاری نگاہوں میں سامان مضحکہ ہے اسی طرح کل تمہارا انجام ہمارے لئے موجب ازدیاد ایمان و اطمینان ہوگا۔ آج تم ہنس رہے ہو کل کو تم روؤ گے اور ہم نصرت الٰہی کے ظہور پر مسرور و مبتہج اور اپنے رب کے شکر گزار ہوں گے۔ بعض مرتبہ جملہ میں صوتی ہم آہنگی کے اقتضا سے لفظ ایک ہی استعمال ہوتا ہے لیکن اس کا مفہوم الگ الگ ہوتا ہے جیسے کہ ' دناھم کما دانوا ' میں ہے۔ کسی کی مصیبت پر خوش ہونا عام حالات میں تو کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن جن لوگوں پر اس طرح حجت تمام ہو چکی ہو جس طرح حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم پر تمام کی ان پر عذاب الٰہی کا نزول حق کی فتح مندی اور باطل کی ہزیمت کا ایک یادگار واقعہ ہوتا ہے جس پر اہل ایمان کا خوش ہونا عین مقتضائے ایمان ہوتا ہے۔

عذاب مقیم کا مفہوم

' فسوف تعلمون ... عذاب مقیم ' یعنی ابھی تو تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو اور ہماری اس تیاری کو خلل دماغ پر محمول کر رہے ہو لیکن عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب تم دیکھ لوگے کہ رسوا کر دینے والا اور ہلاک جانے والا عذاب کن پر نازل ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ عذاب دو قسموں کا ہوتا ہے، ایک تو وہ عذاب ہوتا ہے جس کا مقصد غافلین و منکرین کو جگانا اور جھنجھوڑنا ہوتا ہے تاکہ وہ داعی کی بات پر کان دھریں اور جس خطرے سے وہ ان کو آگاہ کر رہا ہے اس کے آثار دیکھ کر اگر متنبہ ہونا چاہیں تو متنبہ ہو جائیں۔ دوسرا وہ عذاب ہوتا ہے جو

کامل اتمام حجت کے بعد رسول کے جھٹلانے والوں کی جڑ کاٹ دینے کے لئے نازل ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ کن عذاب ہوتا ہے جو ان لوگوں کو ہمیشہ کے لئے رسوا کر کے رکھ دیتا ہے جو رسول کے انذار کا مذاق اڑاتے اور اس کی تنبیہات کو خلل دماغ پر محمول کرتے ہیں۔ یہ محض ایک جھونکا نہیں ہوتا جو آیا اور گزر گیا بلکہ جس قوم اور جس بستی پر نازل ہوتا ہے وہیں ڈیرے ڈال دیتا ہے اور جس کی عبرت انگیز سرگذشت آثار اور کھنڈروں کی شکل میں بھی اور تاریخ کے صفحات میں بھی محفوظ ہو جاتی ہے تاکہ آنے والی نسلیں بھی ان کے انجام سے سبق حاصل کریں۔ نیز یہی عذاب دیباچہ بن جاتا ہے اس ابدی عذاب کا جس سے ان کو آخرت میں سابقہ پیش آئے گا۔

'حتیٰ اذا جاء امرنا و فار التنور ... وما آمن معه الا قلیل'

قوم نوحؑ کے عذاب کی نوعیت

'فار یفور' کے معنی جوش مارنے کے ہیں۔ یہ لفظ پکتی ہوئی ہانڈی کے جوش مارنے اور ابلنے کے لئے بھی آتا ہے اور بھڑکتے ہوئے تنور کے جوش مارنے کے لئے بھی۔ یہاں فار التنور کا محاورہ بطریق استعارہ اس سائیکلونی طوفان کی تعبیر کے لئے استعمال ہوا ہے جو قوم نوحؑ پر آیا جس سے سخت بارش بھی ہوئی اور آس پاس کے سمندروں کا پانی بھی ابل پڑا۔ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ، سورہ ذاریات کی تفسیر میں قوم نوحؑ کے عذاب کی نوعیت واضح کرتے ہوئے آخر میں خلاصہ بحث یوں تحریر فرماتے ہیں :-

"اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قوم نوحؑ پر تند اور چکّر دار ہوا کا طوفان آیا جس سے سخت بارش ہوئی، پاس کے سمندر کا پانی ابل پڑا اور ہر طرف سے موجیں اچھلنے لگیں۔ اس طوفان کے اندر نوح علیہ السلام کا سفینہ کوہ جودی پر جا ٹکا۔" تفسیر سورہ ذاریات از فراہیؒ

'امر' سے مراد اس آیت میں بھی اور آگے آیت ۴۳ میں بھی وہ عذاب ہے جو حکم الٰہی سے ظہور میں آیا۔ فرمایا کہ جب عذاب آیا اور طوفان ابل پڑا، ہم نے نوح کو حکم دیا کہ ہر چیز میں سے نر و مادہ دو دو کو، اپنے اہل و عیال کو اور جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کو اس کشتی میں سوار کرا لو۔

'من کل' کا مفہوم

'من کل' کی تعمیم سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ہوام و حشرات اور کیڑے مکوڑے سب اس میں شامل ہوں بلکہ یہ لفظ معہود ذہنی کو پیش نظر رکھ کر بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی متعدد مثالوں کی طرف ہم پیچھے اشارہ کرتے آئے ہیں۔ اس وجہ سے اس سے مراد وہ جانور ہیں جو اس وقت تک انسان کے تصرف میں آچکے تھے اور اس کی مختلف ضروریات میں کام آرہے تھے۔

الامن سبق والے کے استثنا کی نوعیت

' الامن سبق علیہ القول ' یعنی تمہارے اہل میں سے وہ لوگ اس میں شامل نہیں ہیں جن کے باب میں خدا کا فیصلہ پہلے ہی صادر ہو چکا ہے۔ اس فیصلہ سے مراد وہ فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے شیطان کو روز اوّل ہی اس کے الٹی میٹم کے جواب میں سنا دیا تھا کہ جنوں اور انسانوں میں سے جو تیری پیروی کریں گے میں ان سب کو جہنم میں بھر دوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ جو اس حکم ازلی کی زد میں آ چکے ہیں وہ تو اس میں سوار ہونے سے محروم رہیں گے۔ باقی کو اس میں سوار کرا لو۔

ایمان سے محروم اکثریت گندگی کا ڈھیر ہے

' وما آمن معہ الا قلیل ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ یہ ہولناک طوفان تمام موجود انسانوں کی اکثریت کو بہا لے گیا۔ صرف تھوڑے سے لوگ، جو حضرت نوحؑ پر ایمان لائے تھے، اس سے محفوظ رہے۔ اس سے اللہ جل شانہٗ کی بے نیازی کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اس کی نگاہوں میں وہ اکثریت گندگی کا ایک ڈھیر ہے جو ایمان سے محروم ہے۔ وہ اس گندگی سے اپنی زمین کو پاک ہی دیکھنا پسند کرتا ہے اور محض اس بنیاد پر کہ اس کی مقدار زیادہ ہے اپنی زمین کی پشت پر اس کو لادے رکھنا پسند نہیں کرتا۔ ساتھ ہی اہل ایمان کے لئے اس کی بے پایاں رحمت کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ ہر چند ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو لیکن خدائے رؤف و رحیم ان جواہر ریزوں کی ہر حال میں اپنے دامن رحمت میں حفاظت فرماتا ہے یہاں تک کہ طوفان نوحؑ بھی ان کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ اس پہلو سے اس ٹکڑے میں قریش کی مغرور اکثریت کے لئے وعید بھی ہے اور ان کے اندر کے ان قلیل التعداد اور مظلوم مسلمانوں کے لئے عظیم پیغام تسلی بھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے اور اس دور میں قریش کے ظلم و ستم کے ہدف بنے ہوئے تھے۔

مومن کا مرکز نگاہ

' وقال ارکبوا فیھا ... لغفور رحیم ' اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حضرت نوحؑ نے اپنے ساتھیوں کو کشتی میں سوار ہو جانے کی دعوت دی اور پہلا کلمہ جو اس موقعہ پر ان کی زبان سے نکلا وہ ' بسم اللہ مجرھا ومرسھا الایہ ' ہے۔ یہ کلمہ اس حقیقت کی تعبیر ہے کہ اسباب و وسائل بجائے خود کتنی ہی اہمیت کیوں نہ رکھتے ہوں، لیکن مومن کا اصلی اعتماد اسباب و وسائل پر نہیں بلکہ خدائے رحمان و رحیم کی رحمت و عنایت پر ہوتا ہے۔ اس کی عنایت شامل حال ہو تو مواج و متلاطم سمندر کے اندر لکڑی کا ایک ٹوٹا ہوا تختہ بھی آدمی کے لئے سہارا بن جاتا ہے اور اگر یہ عنایت شامل حال نہ ہو تو عظیم الشان ٹیٹینک (TITANIC) بھی چشم زدن میں موجوں کا لقمہ بن جاتا ہے اور سائنس کی ساری کار فرمائیاں بے حقیقت ثابت ہوتی ہیں۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کام کا آغاز بسم اللہ سے کرنے کی جو ہدایت فرمائی ہے اس میں اصلی رمز یہی ہے کہ ہماری نگاہ صرف

اسباب پر ٹک کے نہ رہ جائے بلکہ اسباب کے پس پردہ جو مسبب الاسباب ہے وہ بھی نگاہ میں رہے اس لئے کہ اسباب اسی کے اذن سے کام کرتے ہیں۔ آخر میں 'غفور رحیم' کی صفات کا حوالہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ جس طرح مجرّد اسباب پر بھروسہ جائز نہیں ہے اسی طرح اپنے اعمال پر بھی، خواہ وہ کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں، غرّہ نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اصل بھروسہ خدا کی مغفرت و رحمت ہی پر ہونا چاہیئے۔ کون جانتا ہے کہ خدا کی میزان میں کس کے عمل کا کیا وزن ٹھہرتا ہے۔

'وھی تجری بھم فی موج کالجبال ... ولاتکن مع الکافرین' کشتی متلاطم موجوں کے اندر چل رہی تھی۔ موجیں اس طرح اٹھ رہی تھیں جیسے کالے پہاڑ اٹھ رہے ہوں (یہ صحیح تصویر ہے طوفانی سمندر کے اندر موجوں کے اٹھنے کی) اتنے میں حضرت نوحؑ نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر ان کا بیٹا (تورات میں اس بیٹے کا نام کنعان آیا ہے) کھڑا ہے۔ اس کو دیکھ کر شفقت پدری جوش میں آگئی۔ اس کو آواز دے کر پکارا 'یٰبنیّ ارکب معنا ولاتکن مع الکافرین' اس پکار میں بیک وقت شفقت اور دعوت دونوں کی روح سموئی ہوئی ہے۔ 'یٰبنیّ' باپ کی طرف سے بیٹے کے لئے نہایت پیار کا خطاب ہے اور 'ولاتکن مع الکافرین' میں گویا آخری دعوت ہے کہ لخت جگر اب بھی موقع ہے کہ ان کافروں کا ساتھ چھوڑ کر ہم میں شامل ہو جا۔ 'وھی تجری' حال کا صیغہ تصویر حال کے لئے ہے۔ اسی طرح 'وکان فی معزل' کے الفاظ بھی اس لئے وارد ہوئے ہیں کہ پورا منظر قاری کی نگاہوں کے سامنے آجائے۔ طوفانی ہوائیں چل رہی ہیں، موسلا دھار بارش ہو رہی ہے پہاڑوں کی طرح موجیں اٹھ رہی ہیں۔ ان موجوں کے تھپیڑوں سے حضرت نوحؑ کی کشتی نبرد آزما ہے کہ اتنے میں نگاہ جو اٹھتی ہے تو دیکھتے ہیں کہ کچھ فاصلہ پر جواں سال بیٹا حالات سے ششدر و سراسیمہ کھڑا ہے۔ آخر یہ بھی تو ممکن تھا کہ یہ منظر ان کو نہ دکھایا جاتا جس طرح دوسرے بہت سارے کفار ان کی نگاہوں سے اوجھل رہ کر ڈوبے اسی طرح یہ بھی نگاہوں سے دور کہیں کسی موج کا لقمہ بن جاتا۔ لیکن نہیں، اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ حضرت نوحؑ بیٹے کے ڈوبنے کا عبرت انگیز تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ یہ حضرت نوحؑ کی وفاداری کا آخری امتحان تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرات انبیا کیسے کیسے امتحانوں سے گزارے جاتے ہیں لیکن اللہ کی توفیق سے وہ ہر امتحان میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ نیز اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ خدا کا قانون جب آتا ہے لاگ ہے کہ نوحؑ کا بیٹا بھی نافرمان ہو تو وہ اس کی گردن بھی عین باپ کے سامنے دبا دیتا ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!!

حضرت نوحؑ کا آخری امتحان

'قال ساٰوی الیٰ جبل ... فکان من المغرقین' بیٹا بھی بڑا ہی ہیٹی تھا۔ یہ ہو ناسک

خدا کی بے نیازی کا آخری منظر

منظر دیکھ کر بھی اس کی ہیکڑی میں کوئی فرق نہ آیا۔ باپ کی اس شفقت بھری دعوت کے جواب میں بولا کہ کچھ پروا نہیں میں کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا وہ مجھے اس پانی سے بچالے گا۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا کہ یہ پانی نہیں بلکہ قہرالٰہی ہے جس سے آج کوئی بچانے والا نہیں بن سکتا۔ صرف وہی اس سے بچ سکتا ہے جس پر اللہ ہی رحم فرمائے۔ اتنے میں ایک موج باپ اور بیٹے کے درمیان حائل ہوگئی اور وہ بھی غرق ہوکے رہا۔ یہ اس ہولناک ٹریجڈی کا آخری منظر تھا۔ اس کے سامنے آجانے کے فوراً بعد آسمان و زمین سب کو احکام صادر ہوگئے کہ بس اب کام پورا ہوچکا!

'وقیل یا ارض ابلعی ماءک ... وقیل بعدا للقوم الظٰلمین' زمین کو حکم ہؤا کہ اپنا پانی نگل لے آسمان کو حکم ہؤا کہ بس اب تھم جا۔

اقلاع 'اقلاع' کے معنی کسی کام سے رک جانے کے بھی ہیں۔ 'یا سماء اقلعی ای امسکی عن المطر'

غیض الماء 'غیض الماء' یعنی چڑھا ہؤا پانی اتر گیا 'غاض یغیض' لازم اور متعدی دونوں آتا ہے۔ 'غاض الماءُ' پانی اتر گیا 'غاض الماءَ' پانی کو اتار دیا۔ یہاں متعدی استعمال ہؤا ہے۔

جودی 'الجودی' کوہستان ارارات کی ایک چوٹی کا نام ہے۔ تورات میں صرف ارارات کا ذکر ہے، قرآن نے خاص اس چوٹی کا ذکر کیا ہے جہاں کشتی جاکر ٹکی۔ اس سے طوفان کی ہولناکی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ چند دنوں میں پانی کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا۔ اگر کسی محدود علاقہ میں بارش اتنی زیادہ ہو کہ نکاس کے تمام راستے اس کے پانی کو باہر نکالنے سے قاصر رہ جائیں تو وہاں پانی کا چڑھ جانا لازمی امر ہے۔

ظالموں پر لعنت 'بعداً للقوم الظٰلمین' اظہار نفرت و لعنت کا جملہ ہے۔ یعنی خس کم جہاں پاک! ان ظالموں پر لعنت ہو!! 'ظلم' سے یہاں اپنی جان پر ظلم مراد ہے۔ یعنی اللہ نے تو ان کو نہایت اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا لیکن انہوں نے اپنی بد اعمالیوں سے اپنے آپ کو خدا کی زمین پر غلاظت کا ایک ڈھیر بنا لیا جس کو صاف کرنے کے لئے خدا کو ایک طوفان بھیجنا پڑا۔

بلاغت کلام کا ایک خاص پہلو 'ونادیٰ نوح ... وانت احکم الحاکمین' یہ دعا حضرت نوحؑ نے اس وقت فرمائی ہے جب بیٹے کو ڈوبتے دیکھا ہے اس وجہ سے بظاہر اس کا حوالہ آیت ۴۳ کے ساتھ آنا تھا لیکن بلاغت کلام کے اقتضا سے اس کا ذکر موخر ہوگیا۔ گویا خدا کی نگاہوں میں یہ شخص، حضرت نوحؑ کا بیٹا ہونے کے باوجود ایسا نابکار تھا کہ جب تک خدا نے اس کو غرق نہیں کر لیا، اس کے باب میں حضرت نوحؑ کی دعا کو زیر بحث لانا بھی پسند نہیں فرمایا۔ اس غضب کی وجہ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں اگر کسی انسان کو سب سے بڑی سعادت اور خوش بختی حاصل ہوسکتی ہے تو وہ یہی ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کسی پیغمبر کے

گھر میں جنم دے لیکن یہی خوش بختی سب سے بڑی بد بختی بھی ہو سکتی ہے اگر وہ اس کی قدر نہ کرے اور ولی کے گھر میں شیطان بن کر اٹھے۔ چنانچہ کلام کی ترتیب ہی سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ اس شخص کو خدا نے سب سے زیادہ مبغوض قرار دیا۔ گویا سارے طوفان کا اصلی ہدف ہی یہی تھا کہ جب یہ ڈوب گیا تو گویا طوفان کے خاتمہ کا اعلان ہو گیا۔

حضرت نوحؑ کی شفقت پدری

حضرت نوحؑ نے یہ دعا شفقت پدری سے مغلوب ہو کر محض 'اہل' کے اس لفظ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرمائی جو اوپر آیت ۴۰ میں گزرا ہے کہ حضرت نوحؑ کو حکم ہوا کہ "اس کشتی میں ہر چیز کے نر و مادہ اور اپنے اہل و عیال کو، بجز ان کے جن کے باب میں خدا کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے، سوار کرا لو" چونکہ 'اہل' کے لفظ میں ان کا بیٹا کنعان بھی بظاہر لفظاً شامل تھا اور یہ بات یقین کے ساتھ ان کے علم میں نہیں تھی کہ یہ خدا کے اس فیصلہ کی زد میں آ چکا ہے جس کا حوالہ ہم نے اوپر 'الا من سبق علیہ القول' کی وضاحت کرتے ہوئے دیا ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے فریاد کی کہ اے رب، میرا یہ بیٹا بھی میرے اہل میں شامل ہے اور تیرا یہ وعدہ کہ تو میرے اہل کو اس کشتی کے ذریعہ سے نجات دے گا سچا وعدہ ہے اور تو سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے۔ مطلب یہ کہ جب یہ تیرا سچا وعدہ موجود ہے تو میرا یہ بیٹا غرق کیوں ہوا؟

اللہ تعالیٰ کی تنبیہ

'قال یا نوح ... انی اعظک ان تکون من الجاھلین' اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ یہ بیٹا تمہارے اس اہل میں شامل نہیں جن کے لئے نجات کا وعدہ تھا۔ نجات کا وعدہ صرف اہل ایمان کے لئے تھا اور تمہارے اہل میں سے اس میں وہی شامل تھے جو ایمان کے رشتہ سے تمہارے ساتھ وابستہ تھے۔

'انہ عمل غیر صالح' یہ اسی طرح کا اسلوب بیان ہے جیسے کہیں 'زید عدل' (زید سراپا عدل ہے) یعنی یہ شخص تمہارے اہل میں کیسے شمار ہو سکتا ہے یہ تو بالکل نابکار و ناہنجار تھا۔ نبی کا گھرانا صرف نسب سے نہیں بنتا بلکہ ایمان و عمل صالح سے بنتا ہے۔ یہ تو ان لوگوں میں شامل تھا جن کے باب میں ہمارا فیصلہ صادر ہو چکا ہے کہ ہم ایسے تمام لوگوں کو جہنم میں بھر دیں گے تو تم ہم سے کسی ایسی بات کے لئے درخواست نہ کرو جس کے باب میں تمہیں کوئی علم نہیں۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو۔ ہم دوسرے مقام میں لفظ 'جہل' کی تحقیق بیان کر چکے ہیں کہ عربی میں اس کا اصلی مفہوم جذبات سے مغلوب ہو جانا ہے۔

حضرت نوحؑ کی توبہ

'قال رب ... اکن من الخاسرین' حضرت نوح علیہ السلام نے اس تنبیہ کے بعد فوراً توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرما لی۔

حضرت نوحؑ کو بشارت

'قیل یا نوح اھبط ... ثم یمسھم منا عذاب الیم' طوفان کے گزر جانے کے بعد یہ حضرت نوحؑ کو ہدایت ہوئی کہ اب خدا کی طرف سے سلامتی اور برکتوں کے سایہ میں زمین پر اترو۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کسی معذب قوم کے اندر سے جو لوگ اپنے ایمان اور اپنی عزیمت کی بدولت نجات پاتے ہیں چونکہ وہ آزمائش کی بھٹیوں سے گزر کر ہر قسم کے غل و غش سے بالکل پاک ہو جاتے ہیں اس وجہ سے رحمت الٰہی ان کی طرف خاص طور سے متوجہ ہوتی ہے اور ان کو اپنی مخصوص برکات و افضال کے سایہ میں پروان چڑھاتی ہے۔ ان کی مثال نہایت صالح بیجوں کی ہوتی ہے جو صالح زمین اور سازگار آب و ہوا میں پروان چڑھتے ہیں۔ اس وجہ سے ہر چند ان کی تعداد تھوڑی ہو لیکن وہ بہت جلد تمام اکناف کو گھیر لیتے ہیں۔ 'وعلی امم ممن معک' یعنی آج اگرچہ بظاہر تمہارے ساتھ صرف چند نفوس ہیں لیکن چونکہ ان پر خدا کی رحمت و برکت ہے اس وجہ سے ان کے اندر بڑی بڑی قومیں اور طیبتیں مضمر ہیں جو بالآخر ظہور میں آئیں گی اور تمام روئے زمین پر چھا جائیں گی۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ طوفان نوحؑ کے بعد یہی نفوس از سر نو آبادی کا ذریعہ بنے۔

ایک تنبیہ

'وامم سنمتعھم ثم یمسھم منا عذاب الیم' ساتھ ہی اس امر واقعہ سے آگاہ فرما دیا کہ آئندہ ان کی نسل سے جو قومیں اٹھیں گی ان میں سب مبارک ہی نہیں ہوں گی بلکہ ان میں ایسی قومیں بھی ہوں گی جو سرور پکڑیں گی اور ہم ان کو ایک خاص حد تک مہلت بھی دیں گے لیکن بالآخر ان کے اعمال کی پاداش میں ہم ان کو ایک دردناک عذاب میں پکڑیں گے۔

آنحضرت صلعم کی طرف التفات

'وتلک من انباء الغیب ... ان العاقبۃ للمتقین' یہ خاتمہ سرگزشت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات ہے کہ یہ سرگزشت نہ تمہارے علم میں تھی اور نہ تمہاری قوم ہی کے۔ یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ اس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے اس سے تم کو بھی آگاہ کیا اور تمہارے واسطہ سے تمہاری قوم کو بھی اس سے آگاہ ہونے کا سامان بہم پہنچایا۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ یہ سرگزشت اس واضح صورت میں اپنے فوائد و نتائج کے ساتھ پہلی مرتبہ قرآن ہی میں بیان ہوئی ہے۔ اس سے پہلے تورات میں اس کے بعض حصے بیان تو ضرور ہوئے تھے لیکن نہایت ہی پراگندہ اور مسخ شدہ شکل میں۔ پھر پچھلے صحیفوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ناواقف تھے اور آپ کی قوم کے لوگ بھی۔ یہ تو قرآن کا فیض ہے کہ اس نے تاریخ کے ان حقائق سے آگاہ کیا اور یہ حقائق جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لئے سبق آموز تھے اسی طرح آپؐ کی قوم اور اس کے اعیان کے لئے تھے۔ 'فاصبر ان العاقبۃ للمتقین' یہ خلاصہ ہے اس سرگزشت کا۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی دعوت پر جمے رہو۔ انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ تمہارے مخالف ناکام و نامراد ہوں گے

مولانا حمید الدین فراہیؒ کی علمی خدمات

تالیف : ڈاکٹر سعید احسن عابدی ——— ترجمہ : خالد مسعود

اس مضمون کے مصنف ڈاکٹر سعید احسن عابدی قاہرہ میں مقیم ہیں۔ بھارت سے اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں جامع الازہر گئے۔ وہاں ڈاکٹریٹ کرنے کی غرض سے داخلہ لیا۔ نگران استاذ کو اس بات کے لئے آمادہ کیا کہ ان کے مقالہ کے لئے حمید الدین فراہیؒ کا عنوان منظور کریں۔ اس موضوع پر مصنف موصوف کو معلومات حاصل کرنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ کیونکہ مولانا فراہیؒ کی تصانیف اور ان کے مسودات صرف پاکستان و بھارت میں تھے۔ نیز مصر میں ایسے لوگ بھی نہ تھے جو مولانا کی صحبت کا فیض حاصل کئے ہوئے ہوں۔ بڑی تگ و دو اور مولانا کے بعض شاگردوں سے خط و کتابت کے بعد مصنف بالآخر ایک مقالہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس پر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ ڈاکٹر صاحب محض ڈگری لینے سے مطمئن نہیں ہوئے بلکہ ان کے پیش نظر یہ مقصد ہے کہ وہ مولانا فراہیؒ کے فکر سے عرب دنیا کو روشناس کریں۔ چنانچہ وہ اس وقت بھی مولانا کی تصنیف 'الرای الصحیح فی من ھو الذبیح' پر ریسرچ کر رہے ہیں اور اپنے نتائج فکر قاہرہ کی علمی مجالس میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ زیر نظر مضمون جس کی پہلی قسط 'میثاق' کے گذشتہ شمارے میں چھپ چکی ہے انہوں نے اسی ریسرچ کے مقدمے کے طور پر لکھا ہے ——— (مترجم)

امام فراہیؒ کوئی پیشہ ور مصنف نہ تھے۔ ان کے پیش نظر عامۃ المسلمین کی اصلاح کا مقصد تھا جسے

وہ علما کی اصلاح کے راستے سے حاصل کرنا چاہتے تھے کیونکہ یہ علما ہی ہیں جن کے ہاتھ میں مسلمانوں کے دینی امور کی باگ ڈور ہوتی ہے اور انہیں وارث انبیاء کہا گیا ہے۔ مولانا فراہیؒ نے جو کچھ لکھا یا جو کچھ لکھنا چاہتے تھے وہ ان تمام علوم کے بارے میں تھا جن کا کچھ بھی تعلق کلام الٰہی کے ساتھ ہے۔ تصنیف کے لئے انہوں نے عربی زبان کا انتخاب کیا کیونکہ یہ زبان اسلام کے فہم میں معاون ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اکناف عالم کے مسلمانوں کی واحد مشترک زبان بھی ہے۔ مولانا کے ایک معاصر نے ایک مرتبہ ان پر یہ اعتراض کیا کہ "آپ اپنی تصانیف اور خاص طور پر قرآن کریم کی تفسیر عربی میں کیوں لکھ رہے ہیں۔ اس زبان کے جاننے والے ہیں کتنے؟ پورے ہندوستان میں ان کی تعداد تو انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے؟" اس کا جواب مولانا نے یہ دیا کہ "میں کتاب اللہ کی تفسیر علما کے لئے لکھ رہا ہوں کیونکہ وہ فکری اور علمی طور پر صحیح راستے سے دور ہو چکے ہیں۔ ان کی اصلاح کے بغیر مسلمان عوام کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنی تفسیر قرآن کے ذریعے علما کو اپنے افکار اور طرز عمل کی اصلاح پر آمادہ ہونے کی دعوت دوں تاکہ اسلامی معاشرہ میں جہاں جہاں کجی پیدا ہو گئی ہے وہ دور ہو۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میرا پیغام بس ایک ہی ملک تک محدود ہو بلکہ میرے پیش نظر یہ بات ہے کہ یہ نقطہ نظر تمام مسلمان ممالک میں عام ہو جائے۔ چونکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر ملک کے مسلمان علماء کی مشترک زبان عربی زبان ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی زبان ہے اس لئے میں نے اپنے فکر اور پیغام کو پھیلانے کے لئے اسی زبان کو منتخب کر لیا ہے۔" مزید برآں مولانا اہل عرب اور ان کی زبان کے بارے میں بڑے پُرجوش تھے۔ وہ عرب کے دفاع کو دین کا دفاع سمجھتے تھے کیونکہ عرب قوم دین اسلام کی حامل بنی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہی کے اندر اور انہی کی نسل سے پوری انسانیت کی طرف مبعوث ہوئے۔

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ یہاں مولانا کی بعض تالیفات پر ایک سرسری سی نظر ڈالیں تاکہ ایک عرب قاری کو اس محنت کا اندازہ ہو سکے جو اس مرد جلیل نے عرب کی خدمت اور اسلام کی اشاعت میں کی ہے۔

۱۔ **تفسیر نظام القرآن** ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے خاتمہ اور برصغیر میں انگریزی استعمار کے غلبہ کے بعد علوم اسلامی کی نشاۃ ثانیہ کی ایک تحریک ابھری جس کا مقصد انگریزی حکومت کے سائے میں پرورش پانے والے عیسائی مبلغوں اور مستشرقین کے ان جھوٹوں کی تردید تھا جن کا مطمح نظر ارکان اسلام کا ہدم اور مسلمان معاشرے اور دین اسلام کے اصولوں کی بیخ کنی کر کے انگریزوں کے لئے ملکی فضا کو سازگار کرنا تھا۔ اس تحریک کا سب سے نمایاں پہلو قرآن کریم کی تفسیر کے لئے ایک نئے اسلوب کو اختیار کرنا تھا جس میں پرانے مفسرین کے روایتی انداز تفسیر کو ملحوظ نہ رکھا گیا جس میں اصل اعتماد عربی زبان اور احادیث نبوی پر

کیا جاتا ہے۔ اس دور استعمار میں پیدا ہونے والے مفسرین کی نیک نیتی اور مقصد کی پاکیزگی کے باوجود کہا جاسکتا ہے کہ وہ صحیح رستے سے ہٹ گئے اور تفسیر میں اپنی رائے کو داخل کر دیا۔ اس رجحان کو اس دور میں اتنی قوت حاصل ہوئی کہ یہ ایک الگ مکتب فکر بن گیا۔ تفسیر بالرائے کرنے والوں کے اس مکتب فکر نے قرآن کی تفسیر اپنی سمجھ کے مطابق کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد آنے والے مسلمانوں سے رہنمائی حاصل نہ کی چنانچہ انہوں نے معجزات، دعا اور دین کے مبادی میں سے اور کئی چیزوں کا صاف انکار کر دیا۔

جونہی امام فراہیؒ نے علوم قرآن اور اسلامی تعلیمات پر غور و فکر کر کے اپنے آپ کو تیار کر لیا انہیں احساس ہوا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اسلام کی صحیح دعوت پیش کریں اور ہندوستان میں مسلم معاشرہ کو مغربی افکار کے استیلا سے بچائیں۔ نیز دوسرے ممالک کے مسلمانوں کی اصلاح احوال کے درپے ہوں انہوں نے محسوس کیا کہ یہ اصلاح اسی وقت ممکن ہے جب مسلمان قرآن مجید کی تعلیم کا نیا انداز اختیار کریں جس کے نتیجے میں ان پر وہ بلند مقاصد واضح ہو سکیں جو قرآن نے پیش کئے ہیں۔ اسلام کی روشن تعلیمات سامنے آ سکیں اور وہ مغربی استعمار کے ملحدانہ پروپاگنڈہ کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کر سکیں۔ نیز ان فقہی اختلافات میں صحیح فیصلہ کر سکیں جو قرآن کریم کی روح سے دور ہونے کے باعث ان میں گھر کر چکے ہیں۔

اس سے قبل کہ مولانا فراہیؒ اس محنت طلب مہم پر آگے بڑھتے یا تفسیر کے میدان میں داخل ہوتے، انہوں نے تفسیر کے نہایت محکم اصول وضع کئے جنہیں اپنے مقدمہ "فاتحہ نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان" میں بیان کیا۔ اس اصول کا مقصد تفسیر بالرائے کے انتشار کو ختم کرنا اور قرآن کی صحیح تعلیم کے لئے راستہ ہموار کرنا تھا۔

امام فراہیؒ کا طریق تفسیر بنیادی طور پر دو اصولوں پر مشتمل ہے جن میں پہلی چیز نظام اور قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کا ربط ہے۔ ان کے نزدیک نظام و ربط کے سمجھنے کی حیثیت نصف قرآن کو سمجھنے کی ہے جو شخص اس سے بے خبر رہے وہ ایک بہت بڑے خزانے سے محروم رہتا ہے۔ مولانا کے نزدیک امت مسلمہ کے اندر فقہی اختلافات کے راہ پانے اور باہم دشمنی اور بغض پیدا کرنے کا اصل باعث نظام قرآن سے علما کی بے پروائی ہے وہ کہتے ہیں "میں نے دیکھا ہے کہ تاویل کے اختلاف کا بڑا حصہ آیات کے ربط کو چھوڑنے کا نتیجہ ہے۔ اگر نظام ظاہر ہوتا اور سورہ کے مقاصد واضح ہوتے تو ہم ایک ہی پرچم تلے جمع ہو سکتے اور ایک مشترک کلمہ پر ہمارا اتفاق ہوتا جو ایک بارآور درخت کی مانند ہوتا جس کی جڑیں پاتال تک گہری اور شاخیں فضا میں پھیلی ہوتیں اس طرح ہم کتاب الٰہی کے رشتہ کو مضبوطی سے تھامنے والے ہوتے جیسا کہ ہمیں حکم ہے " واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا ولا تفرقوا "

نظام سے مولانا کی مراد یہ ہے کہ پوری کی پوری سورہ ایک وحدت نظر آئے جس کی تمام آیات ایک دوسری سے مربوط ہوں اور سابق و لاحق سورتوں سے بھی اس کا جوڑ مل جائے کیونکہ جس طرح بعض آیات جملہ معترضہ کے طور پر آجاتی ہیں اسی طرح بعض سورتیں بھی بطور معترضہ آجاتی ہیں۔ اس بنیاد پر قرآن کو سمجھنے سے وہ ہمیں ایک ہی مسلک میں پرویا ہوا کلام نظر آئے گا۔

دوسرا بنیادی اصول جس کو مولانا نے اپنی تفسیر میں ملحوظ رکھا ہے وہ ہے قرآن کی قرآن کے ذریعے تفسیر۔ وہ سب سے پہلے مفرد الفاظ کے مفہوم اور معانی کو جاننے کے لئے صرف قرآن کو سامنے رکھتے ہیں اور دوسری چیزوں کی طرف اس وقت تک رجوع نہیں کرتے جب تک وہ اس کوشش میں متشابہ معانی والے مفردات کو سمجھنے میں ناکام رہ جائیں۔ اس کے بعد وہ قرآن کا مفہوم سمجھنے کے لئے حدیث نبوی کا سہارا لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ معانی کے فہم میں زمانہ جاہلی کے کلام سے مدد لینے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ مفردات قرآن کو سمجھنے کے لئے بڑی کثرت سے عربی شعر و نثر کی ان امہات کتب کی طرف رجوع کرتے ہیں جن میں عربی کلام کے اسالیب ملتے ہیں۔ علامہ سید رشید رضا نے اپنے رسالہ 'المنار' (شمارہ ۱۲، ۹ ۱۹۰) میں مولانا کے بارے میں یوں لکھا تھا: "انہیں قرآن کا گہرا فہم حاصل ہے ان کے پاس قرآن کی وضاحت اور اس کے قریب و بعید مفہوم کے اخذ کے طریقے اور قاعدے ہیں۔ وہ لغت کے تعین کے لئے اس کے گھاٹ کی طرف کثرت سے رجوع کرتے ہیں اور معانی کے شواہد سے سیراب ہو کر واپس لوٹتے ہیں۔ انہوں نے آیت ان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما (تحریم ۴) کی تفسیر میں کلمہ "صغت" کی وضاحت اسی طرح کی ہے۔"

مفردات القرآن یہ کتاب اپنے نام کے ظاہر کے باوجود قرآن کریم کے الفاظ کا لغت شمار نہیں کی جاسکتی۔ اس میں امام فراہیؒ نے قرآن مجید کے بعض ان الفاظ کی شرح کی ہے جن میں مفسرین اور اہل لغت نے اختلاف کیا ہے۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ 'القرآن یفسر بعضہ بعضا' کے قاعدے کو مدنظر رکھ کر پہلے الفاظ کے معانی کو خود قرآن سے اخذ کرتے ہیں، پھر اس پر دلیل عرب جاہلی کے شعر و نثر کے ذخیرہ کلام سے لاتے ہیں۔ عبرانی زبان سے بھی کثرت سے استدلال کرتے ہیں۔ یہ استدلال خاص طور پر ان الفاظ میں ہوتا ہے جن کے بارے میں مستشرقین کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ عربی الاصل نہیں۔ سورہ عبس میں آنے والے لفظ ابّ کی تحقیق یوں بیان کی ہے "ابّ تر و تازہ اور شاداب گھاس یہ ابّ یؤبّ ابا و ابابا و ابابۃ سے ہے جس کے معنی ظاہر ہونے اور نمودار ہونے کے ہیں۔ یہ قدیم مادہ ہے جس پر بعض لسانی تصرفات ہو جانے کے سبب سے اس کی شکل بدل گئی ہے۔ عربی زبان میں یہ

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

مقالات

یر صدیق حسن مرحوم

جمع و تدوین قرآن

(۳)

یہاں پہ یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ اگر قرآن مربوط اور منضبط تھا تو پھر حضرت ابوبکرؓ کی ہدایت "فاجمعہ" کے کیا معنی ہیں؟ یہ اعتراض برمحل بھی ہے اور وزنی بھی۔ اس کے جواب کا ایک رخ تو یہ ہے کہ یہ روایت جو زہری کی ہے غیر معتبر ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کو غیر معتبر ہونے کے جو دلائل دیئے جاتے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ ان کو یک نظر مسترد کر دیا جائے۔ اس روایت کی سند وغیرہ پر تو بعد میں غور کیا جائے گا، فی الحال یہ مان لیجئے کہ یہ روایت صحیح ہے، ورنہ بخاری جیسا ناقد حدیث اس کو اپنی کتاب میں جگہ کیوں دیتا۔ تب بھی کوئی بات اس حکم میں سمجھ سے باہر نہیں، مشکل ضرور ہے۔

پھر اس ماحول کا سہارا لیجئے، جسے میں نے اوپر عرض کیا ہے، کیفیت یہ ہے کہ آٹھ دس صحابہ کے پاس لکھے ہوئے مدون، مرتب اور مکمل قرآن موجود ہیں، مگر ان نسخوں پر کوئی تصدیق نہیں یعنی کسی نے اس کی توثیق نہیں کی۔ آجکل کی دفتری زبان میں یوں کہہ لیجئے کہ کوئی "سرٹیفائڈ کاپی" اس مصحف کی نہیں ہے۔

آپ غور کریں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا نہ جانتے تھے، جتنے دعوت نامے آپ نے بادشاہوں کو بھیجے وہ دوسرے لوگ لکھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان پر مہر لگا دیتے تھے۔ صلح نامہ حدیبیہ لکھا دوسروں نے اس کی توثیق اور تصدیق آپؐ نے کی۔ یمن کے حاکم کو ہدایت نامہ بھیجا گیا تو سرٹیفائڈ آپؐ نے فرمایا کہ یہ ہدایت ٹھیک ہے۔ تو پھر اگر قرآن کے کسی نسخے پہ آنحضرتؐ کی مہر کا مطالبہ کیا جاتا یا اب کیا جائے تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔

یہ مانا کہ آنحضرتؐ کے وصال کے وقت قرآن مجید کے ایک درجن لکھے ہوئے نسخے موجود تھے، مگر ان میں کسی پہ مہر نہیں تھی کہ یہ نسخہ آنحضرتؐ کا دیکھا ہوا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک بڑی جماعت کے پاس قرآن مجید کے کچھ حصے ہیں، جو ان کو یاد ہیں محفوظ ہیں، کچھ کے پاس لکھے ہوئے صحیفے ہیں، پتھر پہ لکھے ہوئے، ہڈیوں پہ لکھے ہوئے، رقاع پہ لکھے ہوئے۔ مگر یہ لکھے ہوئے حصے ایسے ہیں جو بیک وقت نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً لکھے گئے اور ان میں بھی ممکن ہے کہ ایک حصہ دوسرے سے مختلف ہو۔

شاید یہ بات ناگوار معلوم ہو کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے سے مختلف کیسے ہو سکتا ہے، لیکن اگر آپ ایک لمحہ کے لیے تحمل سے کام لیں اور اس پہ غور کریں کہ آیات کی ترتیب نزول کے وقت بحکم خداوندی متعین ہوتی تھی تو آپ اس نتیجہ سے متفق ہوں گے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔

اس کی بہت واضح مثال سورہ بقرہ کی ۲۸۰ آیت والی حدیث سے ملتی ہے، سورہ بقرہ مدنی ہے، یہ آیت مدینہ میں ہجرت کے بعد نازل ہوئی، اب فرض کیجیے کہ زید کے پاس سورۂ بقرہ اس آیت کے نزول سے کچھ دن پہلے کی لکھی ہوئی تھی اور بکر کے پاس اس کے نزول کے بعد کی، تو دونوں ٹکڑوں میں اختلاف ہوگا۔

پھر یہ بھی نہ بھولیے کہ قرآن کے معاملے میں صحابہ کرام جس احتیاط کو لازم سمجھتے تھے، اس کی ایک مثال آج تک کتب احادیث میں موجود ہے، حضرت عمرؓ جیسا جلیل القدر صحابی زید بنؓ ثابت کو یہ آیت سناتا ہے:

من المهاجرين والانصار الذين اتبعوهم باحسان

زیدؓ کہتے ہیں کہ مجھے تو یہ آیت جس طرح یاد ہے اور (قیاساً) جیسا کہ میرے پاس لکھی ہوئی بھی موجود ہے۔ اس میں انصار اور الذین کے درمیان ایک "واؤ" بھی ہے، اب تحقیق شروع ہوتی ہے، اور جب شہادت زیدؓ کے موافق مل جاتی ہے تو مصحف میں آیت اسی طرح لکھی جاتی ہے، جس کتاب کا نسخہ تیار کرنے میں اتنی احتیاط برتی جائے اور جو طبائع اس احتیاط کو لازمی سمجھتے ہوں وہ کیونکر اس پہ مطمئن ہو سکتے تھے کہ صرف زیدؓ یا اور آٹھ دس حضرات کے پاس جو نسخے ہیں اور جو بہرکیف مصدقہ نہیں ہیں، وہ اس بات کی مسلمہ شہادت ہو سکتے ہیں کہ یہ مصاحف یا ان میں سے کوئی ایک بعینہٖ وہی ہے جس کو حضور اکرمؐ نے اخیر وقت میں مکمل کرایا تھا، اور یہ بھی نہ بھولیے کہ بہت سے مسلمانوں کے پاس ایسے لکھے ہوئے ٹکڑے کلام مجید کے محفوظ تھے، جو آخری نسخے سے مختلف تھے۔ ان مرتب شدہ مصاحف اور ان ٹکڑوں میں اختلاف باعث انتشار ہو سکتا تھا خصوصاً اس وقت جبکہ وہ بزرگ ہستیاں جن کو حضورؐ انور نے قرآن پڑھانے کی اجازت دی تھی، اس دنیا میں زندہ تھیں۔

اگر ان حالات میں کسی کو یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ اگر قرآن کا ایک مصدقہ نسخہ جمع نہ کر لیا گیا تو "تشتیت من القرآن" کا "ذھاب" ہو جائے گا، تو یہ خدشہ بالکل فطری تھا، اور اگر خلیفہ وقت سے یہ استدعا کی گئی کہ آپ بحیثیت خلیفۂ اسلام کے اس مہم کو ہاتھ میں لیں اور ایک نسخہ ایسا لکھوائیں جس کے اوپر آپ کی

مہر تصدیق ثبت ہو تو یہ کونسا گناہ تھا، اور اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ قرآن مرتب نہ تھا یا کم از کم اس کی سورتیں ایک مربوط انداز سے جمع نہ تھیں۔

ان حالات میں جو خلیفۂ وقت تھا اس کا کیا رویہ ہونا چاہیئے تھا۔

ایک تو یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے حکم سے یہ فیصلہ کر دیتا کہ زید کا جو مصحف ہے وہی صحیح مصحف ہے سب لوگ اس کی پابندی کریں، یہ طریقہ کار بہت سہل اور تمام آمرانہ کاموں کی طرح جھگڑوں سے پاک ضرور ہوتا مگر اس جمہوری روح کے منافی ہوتا جس کا دوامی پیغام لے کر اسلام آیا تھا۔

اس کے علاوہ اگر ایسا کیا جاتا تو بکر جس کے پاس زید کے مصحف سے مختلف لکھا ہوا کوئی ٹکڑا ہوتا اس کو کیسے مطمئن کیا جا سکتا کہ اس کا لکھا ہوا مصحف نامکمل ہے، یا درست نہیں ہے، اور بکر کو یہ کہنے کا حق باقی رہتا کہ حضرت ابوبکرؓ نے کسی ایک نسخہ کی تصدیق کرنے سے پہلے لوگوں کو اس بات کا موقع ہی نہیں دیا کہ ان کے پاس جو ذخیرہ قرآن مجید کا ہے اُسے وہ آپ کے سامنے پیش کر سکیں اور حضرت ابوبکرؓ اس کی خامیاں ظاہر کر کے اس کو مطمئن کر سکیں کہ ان کا نسخہ نامکمل ہے، اور ہر غیر جانبدار منصف مزاج اس کی تائید کرتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب یہ پالیسی طے کر لی گئی کہ قرآن کا ایک مستند نسخہ خلیفہ کے لیے لکھ کر جمع (فراہم) کر دیا جائے، تو حضرت عمرؓ نے مسجد نبویؐ میں اعلان فرمایا کہ جس کے پاس قرآن کا جو ٹکڑا بھی موجود ہو وہ لے آئے اور زید کے سامنے پیش کرے۔

یہی طریقہ حضرت ابوبکرؓ نے اختیار کیا، آپ نے ایک نوجوان اور عاقل کاتب وحی کو جس نے عرضۂ اخیرہ میں خود نبی اکرمؐ کی زبانی قرآن سنا تھا، جس نے اپنا لکھا ہوا قرآن آنحضرتؐ کو سنایا تھا، اسی کام پر متعین کیا کہ وہ ایسا نسخہ تیار کرے، اور اعلان کیا کہ جس کسی کے پاس قرآن کا کوئی حصہ لکھا ہوا موجود ہو، یا زبانی یاد ہو وہ اس کو جامع قرآن کے سامنے لا کر پیش کرے، اور اس جامع قرآن کا فرض ہوگا کہ وہ اس پیش کردہ حصے کی صحت پر پہلے اس کی دو شہادتیں لیں کہ یہ حصہ بعینہٖ اسی ترتیب سے ہے جس طرح حضور اکرمؐ سے سنا گیا، اور جب یہ بات متعین ہو جائے تو پھر اسے اپنے نسخے سے مقابلہ کر کے مستند نسخہ میں لکھ دے۔

ظاہر ہے کہ یہ کام بڑی ذمہ داری کا تھا، اور کوئی شخص بھی جسے اپنے فرض منصبی کا احساس ہو اس کی حامی بھرنے سے پہلے بار بار سوچے گا کہ آیا وہ اس ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل ہے یا نہیں۔

قرآن مجید جیسی کتاب کا ایسا نسخہ تیار کر کے اسے قیامت تک کے لئے جاری کر دینا جس میں جمع کرنے والے کے ایمان کے مطابق نہ صرف اس دنیا میں بلکہ دوسرے عالم میں بھی جواب دہی کرنا تھی، کوئی بچوں کا کھیل نہ تھا، زید کا یہ کہنا کہ اگر مجھے پہاڑ ہٹانے کا حکم دیا جاتا تو بھی میں اس کو اس کام کے مقابلہ میں آسان سمجھتا، یہ

ظاہر نہیں کرتا کہ یہ کام اس لیے ان کو مشکل معلوم ہوا کہ قرآن مجید کے ہزاروں غیر مرتب اور غیر مربوط ٹکڑوں کو جمع کرکے مرتب اور اڈٹ کرنا پہاڑ ہٹانے سے زیادہ مشکل نظر آیا، بلکہ اس احساس ذمہ داری کو ظاہر کرتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

اللہ تربت ٹھنڈی رکھے زید بن ثابتؓ کی اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ابن ابی قحافہؓ کو، ایک کی سرکردگی میں دوسرے نے وہ کام کیا جس سے ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جریدہ عالم پر ثبت ہو گیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک اور حقیقت ذہن نشین کر لیجئے۔

بہت سی متفرق چیزوں کو آپس میں منسلک اور مربوط کرنے کے طریقے، ان کی تعداد کے لحاظ سے اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ان کا گمان بھی اوّل نظر میں نہیں ہوتا۔

فرض کیجئے کہ دو عدد دوں ۱۔۲ کو آپ دو ترتیبوں سے رکھ سکتے ہیں، ۱و۲ - ۲و۱ لیکن اگر اس میں ایک عدد اور بڑھا دیجئے۔ اور تین عددوں کو آپس میں مرتب کرنا شروع کیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اب انہیں تین نہیں چار نہیں بلکہ چھ (۲×۳) طریقوں سے مرتب کیا جا سکتا ہے [۱و۲و۳ — ۱و۳و۲ - ۲و۱و۳ - ۲و۳و۱ - ۳و۱و۲ - ۳و۲و۱] اب سات عددوں کو لیجئے، اس کے ممکن طریق کی مجموعی تعداد [۲×۳×۴×۵×۶×۷] ۵۰۴۰ ہوتی ہے یعنی اگر سورۂ فاتحہ کی آیات کو ترتیب دینا شروع کیجئے تو وہ پانچ ہزار چالیس طریقوں سے مرتب کی جا سکتی ہے۔ اس سے آپ قرآن کی موجودہ سورتوں کی ترتیب کا قیاس کر سکتے ہیں، جن کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جائے گی۔

ایسی حالت میں ایک ہی طریق ترتیب پر لوگوں کا اجماع کیوں ہوا، اور قرآن جیسی کتاب کے لیے، اور وہ بھی کل اٹھارہ مہینوں کی قلیل مدت میں یہ سارا کام نپٹا لیا گیا۔ درآنحالیکہ وہ بزرگ جن کے پاس قرآن کے حصے موجود تھے وہ اطراف عالم میں پھیلے ہوئے تھے۔ بعضے تو تین تین دن کی مسافت طے کرکے آتے تھے اور اپنا لکھا یا یاد کیا ہوا قرآن کا حصہ پیش کرتے تھے، اس سے یہ بدیہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جمع قرآن کا کام ایسا نہیں تھا کہ مختلف لوگوں سے لے کر قرآن کی سورتیں جمع کر دی جائیں، پھر انہیں من مانے طریقے سے مرتب کر دیا جائے، بلکہ اس کا وہی مطلب ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر قرآن کے حصے مختلف ایسے حضرات کے پاس تھے جو سارے جزیرۃ العرب میں پھیلے ہوئے تھے، تو اس بات کے چیک کرنے کی کوئی سبیل نہ تھی کہ سارے اجزا جمع ہو گئے یا نہیں۔ اور یہ امکان باقی رہتا ہے کہ اس کا کوئی حصہ اس ذخیرہ کے جمع کرنے سے رہ گیا ہو، مگر یہ شبہ چنداں قابل توجہ نہیں کیونکہ اس شبہ کے خلاف وہ سلبی شہادت دلیل ناطق ہے جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے۔

ایک اور پہلو بھی ذہن میں رکھنے کے لائق ہے کہ جیسے جیسے قرآن پر تحقیق ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے یہ بات روشن ہوتی جاتی ہے کہ آیات کی ترتیب تو ہے ہی، سورتوں کی ترتیب بھی ایک خاص سکیم کے مطابق ہے اور ایک سورہ کا اخیر اور دوسری کا شروع باہم مربوط ہیں۔ مثلاً سورۃ نساء کا اخیر انسان کو توحید اور عدل کی تعلیم دیتا ہے۔ سورۃ مائدہ جو متصلاً اس کے بعد شروع ہوتی ہے اس کی ابتدا بھی یا ایھاالذین آمنوا اوفوا بالعقود یعنی ایمان و عدل کی تعلیم سے ہوتی ہے۔ اگر اس بات کو ذہن میں رکھیئے کہ انسان نے ازل میں توحید کا عہد و پیمان کیا تھا، اور عدل کا تقاضا یہ ہے وعدہ پورا کیا جائے، تو اس ترتیب کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ سورۃ واقعہ کے اخیر میں تسبیح کا حکم ہے، اور اس کے بعد کی سورہ حدید بھی تسبیح سے شروع ہوتی ہے، سورۃ ماعون میں چار باتوں کی مذمت کی گئی ہے۔ ترک صلوٰۃ، ریاکاری، بخل اور منع زکوٰۃ، اس کے بعد متصلاً سورۃ کوثر ہے، جس میں اس کے تقابل کے چار اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ بخل کے مقابل انا اعطیناک الکوثر، ترک صلوٰۃ کے مقابل "فصلّ" نماز کا حکم۔ ریاکاری کے مقابل لربک یعنی اپنے رب کے واسطے دکھاوے کے لیے نہیں، اور منع زکوٰۃ کے مقابل میں وانحر یعنی قربانی کرکے لوگوں کو کھلاؤ پلاؤ۔

میں نے یہاں صرف چھ سورتوں کا ذکر کیا ہے۔ نساء، مائدہ، واقعہ، حدید، ماعون اور کوثر۔ صرف ان چھ سورتوں کو آپس میں ۷۲۰ (۶×۵×۴×۳×۲) طریقوں سے مرتب کیا جا سکتا تھا۔ ان سات سو سے اوپر طریقوں میں سے صرف وہ طریقہ کیسے ہاتھ لگ گیا جو ان کی ترتیب کا بہترین طریقہ تھا۔ اس کو بخت و اتفاق نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کہ بخت و اتفاق ایک مرتبہ یا چند مرتبہ یا کچھ اس سے بھی زیادہ پیش آ سکتا ہے، مگر ایک ہی طرح کے لاکھوں واقعات کو بخت و اتفاق کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔

اس لیے لامحالہ ماننا پڑے گا کہ سورتوں کی ترتیب میں کوئی باہمی ربط ہے۔ اور اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) یا تو یہ ترتیب خود صاحب قرآن کی دی ہوئی ہے۔

(۲) یہ محض ایک معجزہ ہے۔

دونوں صورتوں میں یہ امر یقینی ہے کہ یہ کام امت کا نہیں ہے، خواہ وہ امت خیر القرون کی ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے اس نتیجہ پہنچے بغیر چارۂ کار نہیں ہے کہ ترتیب سور انسانی نہیں بلکہ الہامی ہے۔

حضرت زیدؓ کہتے ہیں کہ میں نے قرآن عسیب، لخاف اور صدور الرجال سے جمع کیا[1] اس کا مطلب

---

[1] عسیب، کھجور کی شاخ اور شام میں کے درختوں کا وہ حصہ جو تنے سے متصل ہوتا ہے۔ لخاف سفید رنگ کے پتھر کی چوڑی تختیاں۔

بھی صرف یہی ہے کہ یہ سب کام اس نسخہ کو مرتب کرنے کے لیے کیا گیا تھا، جو خلیفۂ وقت کے پاس رکھا جاتا تھا۔

مختلف روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت زیدؓ کا طریق کار وہی تھا جو آجکل کے محققین کرتے ہیں یعنی پہلے اس تمام مواد کو جو کسی موضوع پر فراہم ہو سکتا ہے، جمع کرتے ہیں، پھر اس کی چھان بین کرتے ہیں، اور جو چھان بین سے صحیح ثابت ہوتا ہے اس سے ایک کتاب مرتب کرتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کی منادی کے بعد صحابہ دور دور سے آتے اور قرآن کا جو حصہ انہیں یاد ہوتا یا جو ان کے پاس لکھا ہوا ہوتا اسے زیدؓ کے سامنے پیش کرتے، زیدؓ کو قرآن مجید زبانی بھی یاد تھا، اور ان کے پاس لکھا ہوا بھی موجود تھا، پھر بھی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ خود اپنی یاد اور اپنی مکتوبہ تحریر سے مقابلہ کر لینا کافی تصور نہیں کیا۔ بلکہ اسلامی اصول شہادت کے مطابق اس کی دو گواہیاں لیتے تھے۔ کہ قرآن کا جو حصہ پیش کیا گیا ہے اسے نبی کریم صلعم سے بعینہٖ اسی طریق سے سنا گیا تھا۔

آج کی دوڑ دھوپ کی دنیا میں اس احتیاط کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کسی کے قول کی صحت کی تحقیق کے لیے اتنی چھان بین کی ضرورت ہے، اور ایسا عملاً ممکن بھی ہے یا نہیں، اور پھر اہتمام کے ساتھ کہ نہ صرف کہنے والے کا مطلب ادا کر دیا جائے بلکہ بعینہٖ اور بجنسہٖ وہی الفاظ بھی استعمال کیے جائیں اور اس ترتیب اور وقفہ کے ساتھ جس طرح کہنے والے نے کہا تھا، اور زبان وحی ترجمان سے قرآن کا جو لفظ بھی جس طرح ادا ہوا تھا، وہ بلا ادنیٰ تغیر کے ٹھیک ٹھیک اسی طرح ادا کیا جائے اور بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس وقت تک دنیا کی کوئی کتاب چھوٹی سے چھوٹی یا بڑی سے بڑی ایسی نہیں ہے جس میں اس احتیاط سے کام لیا گیا ہو۔

اسے مان لینے میں تامل نہیں کہ یہ بحث زیادہ تر ترتیب آیات کو ثابت کرتی ہے اور ترتیب سور سے اس کا تعلق دور کا ہے، مگر تعلق سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اس لیے یہ بحث ترتیب سور سے بالکل غیر متعلق بھی نہیں ہے۔ کیونکہ جب آیات کی ترتیب ایک نہج پر قائم ہو گئی تو سورتوں کی ترتیب بھی بالواسطہ اسی طرح قائم ہوئی۔

اس کو زیادہ واضح طور پر یوں سمجھئے کہ بفرض محال ایک شخص کو قرآن اس طرح یاد ہے کہ پہلے سورۃ الناس پھر فلق، پھر کوثر، پھر اخلاص، دوسرے شخص کو فلق، پھر کوثر، پھر اخلاص۔ تیسرے کے پاس لکھی ہوئی ترتیب کچھ اور ہے۔

جب یہ ٹکڑے پیش کیے جاتے ہیں تو جامع "قرآن کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے نسخہ میں ان سورتوں کو کس ترتیب سے لکھے، یونہی رہنے دے، قرعہ ڈالے، استخارہ دیکھے اور بخت و اتفاق کے ہاتھوں ترتیب ملے

کا فیصلہ کرائے، یا خود اپنی ذہانت اور دوسرے ساتھیوں کی اعانت سے اس ترتیب کو طے کرے۔

ترتیب سور کوئی اہم چیز ہے یا نہیں، اس کے متعلق اوپر عرض کیا جا چکا ہے، اگر ترتیب سور میں بھی قرآن کی کوئی سکیم ہے، جیسا کہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، تو یہ نتیجہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ترتیب سور کی سکیم خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم متعین فرما گئے تھے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

پہلی بات تو یہ ہے کہ "عرضۂ اخیرہ" میں رسول اکرمؐ نے پورا قرآن دو بار حضرت جبرئیلؑ کو سنایا تو کیا دونوں بار علیحدہ علیحدہ ترتیب سے قرآن سنایا گیا یا ایک ہی ترتیب سے قرآن سنایا گیا۔

حضرت زیدؓ کے پاس لکھا ہوا قرآن کا جو نسخہ تھا، اس میں لازمی طور پر سورتیں کسی ترتیب ہی سے رہی ہوں گی۔ "عرضۂ اخیرہ" میں زیدؓ اور ابی بن کعبؓ دونوں شامل تھے، اگر اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کی ترتیب زیدؓ یا ابی بن کعبؓ کے نسخے کی ترتیب سے مختلف تھی تو زیدؓ یا ابی بن کعبؓ کو یہ بات کیوں نہیں کھٹکی کہ جس ترتیب سے نبی کریمؐ نے قرآن سنایا ہے، اس ترتیب سے وہ اپنے نسخہ کو مرتب کریں۔

جو کلام رٹ لیا جائے اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر اس کی ترتیب الٹ پلٹ دی جائے تو حافظ آسانی سے اپنی یاد سے اس بدلی ہوئی ترتیب سے نہیں سنا سکتا، یادداشت کی کمی بیشی کی کیفیت ٹیپ ریکارڈ کی جیسی ہوتی ہے، اس میں جس ترتیب سے آواز بھری جائے گی اسی طرح ترتیب سے اسے چلانے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔

اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ جس ترتیب سے یاد ہے، اگر اس ترتیب سے سنایا جائے تو اس کا امکان نہیں رہ جاتا کہ کوئی حصہ سنانے سے رہ گیا ہے اور بلا ترتیب گڈ مڈ طریقہ سے سنانے میں اس کا امکان رہتا ہے۔

اس کا بڑا آسان تجربہ ہے۔ ایک سے سو تک کی گنتی کس کو یاد نہ ہوگی، اس گنتی کو یاد سے بلا ترتیب لکھنے کی کوشش کیجئے تو دیکھئے کہ کتنی مرتبہ میں آپ پوری گنتی لکھ پاتے ہیں، اس عمل میں ہر مرتبہ آپ کو بار بار یہ غور کرنا پڑے گا کہ کوئی عدد چھوٹ تو نہیں گیا۔

قرآن میں تو سو سے بھی زیادہ ایک سو چودہ [۱۱۴] سورتیں ہیں، ان سب کو ایک ساتھ سنا دینا صرف اسی وقت ممکن ہے جب یہ سب سورتیں ایک سلسلہ میں منسلک ہوں، اور یہ سنانا صرف ایک ہی دفعہ نہ ہو بلکہ تین دفعہ ہوا ہو، عرضۂ اخیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بار قرآن سنایا اور حضرت زیدؓ نے بھی اس سال ایک بار قرآن سنایا۔

یہ مانا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت حافظہ غیر معمولی تھی، اور یہ بھی مان لیا جائے کہ "آپ کا معجزہ تھا کہ غیر منسلک سورتوں کو شروع سے آخیر تک بغیر کسی کمی اور زیادتی کے ایک بار نہیں بلکہ دو بار سنا دیا"، لیکن حضرت زیدؓ تو یہ معجزہ نہیں دکھا سکتے تھے، ان کو قرآن سن کر یہ کیسے اطمینان ہو گیا کہ پورا قرآن بلا کم و کاست انہوں نے سن

لیا ہے۔ اور ان کا یہ اطمینان اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن سننے کے بعد انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ نے پورا قرآن سنا دیا ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ اور یہ صرف اس وقت ممکن ہو سکتا تھا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ترتیب تلاوت سور بعینہ وہی ہوتی جیسی کہ زیدؓ اور ابی بن کعبؓ کے مصحفوں میں تھی۔

ایک اور چھوٹی سی بات جو اس سلسلے سے ذہن میں رکھنے کی ہے، یہ ہے کہ متعدد کتب احادیث میں یہ روایت ملتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کو چار حصوں میں تقسیم کیا تھا۔

(۱) سبع طوال، بقرہ سے یونس تک۔

(۲) مائین: یونس کے بعد کی سورتیں، جن میں سَو سے کم آیتیں ہیں۔

(۳) مثانی: مائین کے بعد کی سورتیں، سورۂ قاف تک۔

(۴) مفصل: قٓ سے والناس تک۔

تلاوت میں سہولت کے لیے قرآن مجید کو مختلف حزبوں میں تقسیم کر لیا گیا تھا، اوس بن حذیفہ ثقفی کے بیان کے مطابق ان حزبوں کی تقسیم تین، پانچ، سات، نو، گیارہ اور حزبِ مفصل پر تھی۔

اس روایت کا متعلقہ حصہ یہ ہے:

سألنا اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلّم من احزاب القرآن کیف تحزبونه فقالوا ثلاث وخمسین وسبع وتسعة، واحدی عشر وحزب المفصل۔

یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ثقیف کے وفد کے موقع پر پیش آیا، مسلم کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "بقرہ اور آل عمران پڑھو" بخاری میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "بنی اسرائیل، کہف، مریم، طٰہٰ، انبیاء میرا خزانہ ہیں"۔ ایک دوسری حدیث ہے کہ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بستر استراحت پہ تشریف لے جاتے تھے تو اخلاص، فلق اور الناس پڑھ کر دم کر لیتے، بعینہٖ یہی ترتیب کلام مجید کی سورتوں کی آج بھی ہے۔

اس سے پہلے سر ولیم میور کی یہ رائے پیش کی جا چکی ہے کہ قرآن میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی، ورنہ محمدؐ کے راوی جنہوں نے محمدؐ کی چھوٹی سے چھوٹی بات روایت کی ہے، اسے ضرور روایت کرتے۔ یہ اعتراف اس لئے ناگزیر تھا کہ واقعۃً سیرتِ طیبہ کے متعلق چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی روایات میں موجود ہیں۔ اس کی وجہ اولاً تو یہ تھی کہ اصحاب نبی کریمؐ کو ذاتِ نبویؐ سے بے انتہا عشق تھا۔ دوسری بڑی وجہ یہ حکم تھا کہ خواہ ایک آیت ہو یا ایک چھوٹا سا جزئیہ میرے متعلق ہو تم لوگ دوسروں تک پہنچا دو۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا کی کوئی ہستی ایسی نہیں ملتی ہے جس کی زندگی کے متعلق اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں اتنی جزئیات، اتنی تفصیل سے قلمبند کی گئی ہوں، جتنی اس ذات گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھی گئیں اور جسے آج بھی لوگ اس ذوق و شوق سے پڑھتے اور اس پہ کاربند ہونے کی کوشش کرتے ہوں۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے، نپولین کی ایسی شخصیت ہے جو تاریخ کی پوری روشنی میں ظاہر ہوئی اور جس کے حالات بہت ہی تفصیل سے مرتب کئے گئے، لیکن اس کی زندگی کے متعلق بھی وہ تفصیلات نہیں ملتیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ملتی ہیں، اور جہاں ان جزئیات کا تعلق کسی مذہبی معاملہ سے ہو وہاں تو اس کی ہلکی سے ہلکی جنبش لب، ہلکے سے ہلکے اتار چڑھاؤ بھی سپرد قلم کر دیا گیا ہے۔ نمونۃً اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

عن انسؓ انہ سئل عن قرأۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال کانت مدا ثم قرأ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، بمد اللہ وبمد الرحمٰن (اتقان)

حضرت انسؓ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے کہا کہ آپ کھینچ کر پڑھتے تھے، پھر بسم اللہ پڑھی اور لفظ اللہ اور الرحمٰن کو کھینچ کر پڑھا۔

بخاری شریف میں ہے:۔

کان یمد بسم اللہ و یمد الرحمٰن و یمد الرحیم۔

بسم اللہ کو کھینچ کر پڑھتے اور الرحمٰن اور الرحیم کو مد کے ساتھ پڑھتے۔

شمائل ترمذی میں روایت ہے:

عن یعلی بن مملک انہ سئل ام سلمۃ عن قرأۃ رسول اللہ فاذا ھی تنعت قرأۃ مفسرۃ حرفا حرفا۔

حضرت امام سلمہؓ سے رسول اکرمؐ کی قرأت کا طریقہ دریافت کیا گیا تو انہوں نے وضاحت سے حرفاً حرفاً بیان کیا۔

اسی شمائل میں شعبہ کی ایک روایت ہے کہ جب سرکار دو عالمؐ مکہ میں داخل ہو رہے تھے تو آپ کی زبان مبارک پر سورۂ فتح تھی اور اس کے بعد کہتے ہیں:

قال ورجع

آپ نے ترجیع فرمائی

ایک اور روایت اسی کتاب کی ہے، جس میں ہے کہ

کان النبی حسن الوجہ حسن الصوت وکان لا یرجع

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خوش جمال، خوش آواز تھے اور ترجیع نہیں کرتے تھے۔

یہاں یہ بتانا مقصود نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ترجیح کرتے تھے یا نہیں، مقصد صرف اس قدر ہے کہ اصحاب نبی کریمؐ آپ کی ادنیٰ ادنیٰ بات کو روایت کرتے تھے، اور جس بات کا تعلق مذہب یا اس کے سرچشمہ قرآن سے ہوتا تھا۔ اس کو اس تفصیل سے یاد رکھتے تھے کہ کس حرف کو آپ نے کس طرح ادا کیا اور کس لفظ کو کھینچ کر پڑھا، اور اس پہ اصرار کرتے تھے کہ قرآن بالکل اسی طرح پڑھا جائے جس طرح رسول اکرمؐ نے تعلیم دی ہے۔ بخاری میں روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ہشام کو سورۂ فرقان پڑھتے سنا تو ان کی گردن میں چادر ڈالی، رسول اکرمؐ کی خدمت میں گھسیٹ لائے اور عرض کی کہ انی سمعت ھذا یقرأ القرآن غیر ما اقرأتنیھا کہ یہ قرآن اس طرح نہیں پڑھتے ہیں، جس طرح آپ نے ہم کو پڑھایا ہے

رموز اوقاف قرآن جو قرآن کے ہر نسخہ کے شروع میں تحریر ہوتے ہیں، ان کو ملاحظہ فرمائیں۔ پھر خود کلام مجید کا کوئی صفحہ کھول لیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ بہت سی جگہوں پہ رکنے کا اور بہت سی جگہوں پہ نہ رکنے کا، کہیں وصل کا، کہیں فصل کا، کہیں بغیر سانس توڑے ہوئے ایک خفیف وقفہ کا اشارہ ملے گا اور اس میں سے ہر چیز ذات گرامی کے عمل پہ منتہی ہوتی ہے۔

اسلم جیراجپوری لکھتے ہیں: "سات قاری تھے، عثمانؓ، علیؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، ابن مسعودؓ ابوالدرداءؓ، اور ابوموسیٰ اشعریؓ۔ ان لوگوں کی قرأتوں میں کہیں مخارج حروف اور ان کی کیفیت ادا میں اختلافات واقع ہو گئے تھے، بعض لوگوں نے ان اختلافات کو منضبط کرنا شروع کیا، یہی لوگ قراء کے نام سے موسوم ہوئے ہر ایک قرأت کو اپنے شیوخ و اساتذہ سے نقل کرتا تھا، یہ روائتیں مسلسل باسناد ہوتی تھیں"[1]

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ کلام مجید کے متعلق جہاں اتنی تفصیل سے باتیں یاد رکھی گئیں کہ آیت کے کس لفظ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھینچ کر پڑھا، کسے ملا کر پڑھا، کہاں وقف کیا، کہاں سانس توڑی، کہاں نون یا علان پڑھا، کہاں نہیں پڑھا۔ اس کتاب کے متعلق لوگوں نے یہ یاد نہ رکھا کہ کونسی سورہ پہلے ہے اور کونسی بعد میں، اس کو کونسی عقل تسلیم کر سکتی ہے۔

ایک روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے آل عمران پہلی رکعت میں پڑھی، بقرہ دوسری رکعت میں، یہ اور اسی قسم کی دوسری حدیثیں جو سورتوں کی قرأت کے متعلق پائی جاتی ہیں، ان میں دو باتیں قابل توجہ ہیں۔

پہلی یہ کہ ان حدیثوں سے نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس زمانہ کا واقعہ ہے، آپ اگر میرے اس نظریہ سے متفق ہیں کہ قرآن ہر زمانہ اور تمام اوقات میں ایک منظم اور مرتب کتاب کی شکل میں مدون تھا اور اصحاب کے پاس

---

[1] تاریخ القرآن

اسی نظم و ترتیب سے جمع تھا، تو دوسری بات قابلِ توجہ بات ہوگی کہ ان حدیثوں سے ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ راوی نے جب یہ کہا کہ آل عمران پہلے پڑھی اور بقرہ بعد میں تو اس کے تحت الشعور میں یہ بات موجود تھی کہ مصحف میں اس کی ترتیب معکوس ہے، اس کی تائید معکوس ہے، اس کی تائید من قراء قرأنا معکوسا کی روایت سے ہوتی ہے۔ یعنی قرآن میں سورتوں کی ایک ترتیب تھی جس کے خلاف پڑھنا معمول نہ تھا، اس لیے جب اس کے برعکس آپ نے نماز میں قرأت فرمائی تو یہ بات فوراً لوگوں کی نوٹس میں آگئی - اس سے ترتیب سور کی ایک مزید شہادت ملتی ہے۔

دوسرا رخ اس کا یہ ہے کہ ان احادیث سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضور اکرمؐ نے نماز میں مختلف رکعتوں میں سورتوں کی قرأت میں وہ ترتیب ملحوظ نہیں رکھی جو مصحف میں تھی، اس لیے نماز میں سورتوں کا قرآنی ترتیب سے پڑھنا ضروری نہیں ہے، لیکن اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن میں ترتیب سور تھی ہی نہیں، یا آپ نے مصحف میں ترتیب فرمائی نہیں۔

ان دلائل کی روشنی میں یہ نتیجہ کہ آنحضرتؐ نے خود سورتوں کی ترتیب نہیں فرمائی تھی، بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے - یہی وجہ ہے کہ اکثر اکابر علماء کی رائے ہے کہ ترتیب سور بھی اسی طرح توقیفی ہے جیسے ترتیب آیات۔ بے موقع نہ ہوگا - اگر یہاں دو ایک بزرگوں کی رائے نقل کر دی جائے۔

مشہور اندلسی عالم ابن حزم ظاہری اپنی کتاب الفصل میں لکھتے ہیں۔

من قال ان تقسیم الآیات و ترتیب مواضع سورہ فعلہ الناس لیس من عند اللہ، فقد کذب۔ ھذا جاھل و افک افتراہ (تاریخ القرآن رحمانی)	جو یہ کہتا ہے کہ آیات کی تقسیم اور سورتوں کی جگہوں کی ترتیب لوگوں نے متعین کر دی ہے، اللہ کی طرف سے نہیں ہے وہ جھوٹا ہے جاہل ہے اور اس نے افک و افترا سے کام لیا۔

ابن حزم اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اگر سورتوں کی ترتیب انسانی ہوتی تو اس کے تین طریقے ہو سکتے تھے، یا تو ترتیب زمانہ نزول کے لحاظ سے ہوتی یا سورتوں کی مقدار (سائز) کے لحاظ سے، یعنی پہلے بڑی، پھر چھوٹی، پھر اس سے چھوٹی یا اس کے برعکس، پہلے چھوٹی پھر بڑی، پھر اس سے بڑی۔ لیکن موجودہ قرآن کی ترتیب سور ان تینوں طریقوں سے مختلف ہے، اس لیے یہ ترتیب انسانی نہیں الہامی ہے۔

اگر آپ نے مستشرقین یورپ کی تحریروں کو پڑھا ہوگا تو دیکھا ہوگا کہ یہ سب بڑی شد و مد سے کہتے ہیں کہ قرآن میں سورتوں کی ترتیب میکانکی ہے، پہلے بڑی بڑی سورتیں لکھی گئی ہیں، پھر اس سے چھوٹی، پھر اس سے چھوٹی، قرآن کا جو ایک ورقی عکسی مخطوطہ ہے اس کو دیکھئے، بادی النظر میں اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے

اس مخطوطہ میں جہاں جہاں قرآن کی سورتیں ختم ہوئی ہیں، وہاں سرخی سے نشانات بنائے گئے ہیں۔ یہ سرخ نشانات پہلے دور دور ہیں پھر قریب ہو جاتے ہیں، اور پھر قریب تر۔

قرآن کی احزاب میں تقسیم والی جو روایت پیش کی جا چکی ہے، اس میں بھی کچھ ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے سبع طوال، سات بڑی سورتیں، پھر مائین، پھر اس سے کم، سو آیتوں والی سورتیں، پھر مثانی، پھر بقیہ ان سے چھوٹی، وقس علیٰ ہذا۔

عام طور پر خیال بھی یہی ہے کہ قرآن کی سورتوں کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ پہلے بڑی، پھر اس سے چھوٹی، پھر اس سے چھوٹی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کی جو تقسیم احزاب میں کی گئی ہے وہ بادی النظر میں مجموعی طور پر یہ ظاہر کرتی ہے کہ ترتیب سور سائز کے لحاظ سے ہوئی ہے، یعنی احزاب کی مجموعی تصویر کچھ ایسی ہے کہ سورتیں اس میں اپنے حجم کے لحاظ سے مرتب ہیں، سوال یہ ہے کہ آیا یہ بات ابن حزم کو نظر نہیں آئی یا اس میں کوئی اور بات ہے جو سطحی نہیں ہے۔

احزاب کے اندر جو سورتیں ہیں ان کے حجم پر غور فرمائیے، یہ امر متفق علیہ ہے کہ سورت کا حجم اس میں آیات کی تعداد کے لحاظ سے مقرر کیا جاتا ہے، آیتیں ایک حجم یا سائز کی نہیں ہیں، کوئی آیت بہت بڑی ہے، جیسے آیت الکرسی۔ کوئی بہت چھوٹی، جیسے "ثم نظر" اس لیے اگر سورتوں کا سائز آیتوں کی تعداد کے لحاظ سے متعین کیا جائیگا، تو یقینی طور پر ایک سورت اور دوسری سورت میں آیتوں کی تعداد برابر ہونے کے باوجود سائز میں فرق ہوگا، لیکن چونکہ یہ امر معرض بحث میں نہیں ہے اس لئے اس پر توجہ نہیں دی جا رہی ہے، صرف بسبیلِ تذکرہ یہ عرض کر دیا گیا ہے۔

۱۔ احزاب میں سے کسی حزب کو لے لیجئے، اور ان میں سورتوں کے درمیان جو ترتیب ہے اس پر آیتوں کی تعداد کے لحاظ سے غور کیجئے۔

اس وقت میرے سامنے کلام مجید کی چوتھی منزل سورۂ اسراء ہے۔ سورۂ فرقان تک ان تین آیات کی تعداد حسب ذیل ہے:۔

(۱)	اسراء	۱۱۱	(۴)	طٰہٰ	۱۳۵	(۷)	مومنون ۱۱۸
(۲)	کہف	۱۱۰	(۵)	انبیا	۱۱۲	(۸)	نور ۶۴
(۳)	مریم	۹۸	(۶)	حج	۷۸	(۹)	فرقان ۷۷

غور کیجئے کہ اس میں پہلی تین سورتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات کی تعداد کے لحاظ سے سورتیں رکھی گئی ہیں۔ پہلے سب سے زیادہ، پھر اس سے کم، پھر اس سے کم۔

چوتھی سورہ میں آیات کی تعداد ۱۳۵ ہے، جو تمام سورتوں سے زیادہ ہے، اس کے بعد سورۂ انبیاء میں ۱۱۲ آیتیں ہیں، پھر حج میں ۷۸، مومنوں میں ۱۱۸، نور میں ۶۴ اور فرقان میں ۷۷ ہیں۔ اگر محض تعداد آیات سے سورتوں کا مقام متعین ہوتا تو طٰہ ایک نمبر پر ہوتی، پھر مومنوں، پھر انبیاء، پھر اسرا وغیرہ۔ اور سب کے آخر میں سورۂ نور۔

قرآن کے اور احزاب کو بھی اسی طرح بالاستیعاب دیکھ لیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مستشرقین کا یہ دعویٰ کہ قرآنی سورتوں کی ترتیب میکانکی ہے، کتنا اوچھا اور باطل ہے، ان خدا کے بندوں سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ذرا محنت کرکے آیتوں کی تعداد مختلف سورتوں میں دیکھ لیتے، قبل اس کے کہ اس قسم کا دعویٰ کر دیتے جس کا کوئی ثبوت واقعتہً نہیں ہے۔

ہاں ایک بات ضرور اس توجیہ کی تائید میں کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ صحابہ کرام عام طور سے گنتی نہ جانتے تھے، اس لیے انہوں نے محض اندازے سے سورتیں گڈمڈ کر دیں، جن کو بعد میں لوگوں نے گنا۔

مگر خود ان مستشرقین کے قول کے مطابق ترتیب سور ۱۲ھ میں ہوئی، جب یمامہ کی جنگ ہو چکی تھی، زکوٰۃ کی وصولیابی شروع ہو چکی تھی، جب عمال وصولی زکوٰۃ کے لیے مقرر ہو چکے تھے، اور حساب کرکے کسی سے بکری کا بچہ، کسی سے غلہ، کسی سے درہم و دینار وصول کرتے تھے، جب بیت المال سے لوگوں کے وظائف مقرر ہو چکے تھے، اور ان سب کے لیے گنتی جاننا اور حساب لگانا ضروری تھا،

جو لاکھوں کا حساب کر سکتے تھے ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ بیچارے یہ اندازہ نہیں لگا سکے کہ ۱۳۵ - ۹۸ سے زیادہ ہے، کس طرح قابلِ یقین ہو سکتا ہے۔

دوسرا قول امام مالک کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ قرآن جو اب ہمارے پاس ہے، صحابہ نے اس کو اسی ترتیب کے ساتھ لکھا تھا، جس ترتیب سے آنحضرتؐ کو پڑھتے سنا تھا[1]

امام بغوی کہتے ہیں، صحابہ نے قرآن کو اس ترتیب سے جمع کیا جس ترتیب سے آنحضرتؐ کو پڑھتے سنا گیا۔

قاضی ابوبکر کہتے ہیں، کہ سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے، جس طرح آیات کی ترتیب حضرت جبرئیلؑ نے آنحضرتؐ کو بتائی تھی، اسی طرح سورتوں کی ترتیب بھی بتائی تھی، جس قدر قرآن اتر چکا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان میں اس کو دہرا لیا کرتے تھے، اور حضرت جبرئیلؑ مرتب کرا دیا کرتے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ازالۃ الخفا میں حضرت عثمانؓ کے متعلق لکھتے ہیں کہ

---

[1] تاریخ القرآن حافظ اسلم جیراجپوری۔

جمع کرد قرآن را بحضور آنحضرت و ترتیب داده بود آں را "

مولانا فراہی لکھتے ہیں[1]: "قرآن کے اندر نظم کی تلاش میں میں تنہا نہیں ہوں۔ مجھ سے پہلے بھی علماء کی ایک جماعت نے اس راہ میں کوششیں کی ہیں، چنانچہ علامہ سیوطی اتقان میں لکھتے ہیں: " ابوحیان کے شیخ علامہ ابوجعفر ابن زبیر نے خاص اس عنوان پر ایک کتاب تالیف کی ہے اس کا نام " البرهان فی مناسبة سور القرآن " ہے۔ اس کے بعد سیوطی لکھتے " نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے۔ اس کے اشکال کی وجہ سے علماء نے اس سے بہت کم بحث کی ہے۔ امام فخرالدین رازی تنہا شخص ہیں جنہوں نے اس کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی ہے، انہوں نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ " قرآنی حکمت کا بڑا حصہ ترتیب و نظم کے اندر چھپا ہوا ہے"

خود مجھے امام رازی کی تفسیر کبیر میں آیت ولو جعلناه قرآنا عربیا الآیة حم سجدہ کے تحت نظم قرآن سے متعلق ان کا مندرجہ ذیل بیان ملا۔

" اس آیت کی شان نزول کے بارے میں یہ روایت ہے کہ کفار نے از راہ شرارت کہا کہ قرآن مجید کسی عجمی زبان میں کیوں نہیں نازل کیا گیا۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ میرے نزدیک اس طرح کی باتوں سے قرآن مجید پر سخت اعتراض لازم آتا ہے "

" اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن کی ایسی آیتیں بھی ہیں جن میں باہمدگر کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ چیز قرآن مجید پر ایک بڑے اعتراض کا دروازہ کھولتی ہے، اس اعتراض کے ہوتے ہوئے قرآن کا ایک معجزہ ثابت کرنا تو الگ رہا، ہم اس کے ایک منظم کتاب ہونے کا بھی دعوےٰ نہیں کر سکتے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں: (ملحدین نے) قرآن مجید پر بے نظمی کا الزام لگایا۔ اور میں نے دیکھا کہ علمائے اسلام اس کے جواب میں بجائے اس کے کہ حق کا اظہار کرتے اور کتاب الٰہی سے اس الزام کو دفع کرتے اس قسم کی باتیں خود بولنے لگے جس قسم کی باتیں ملحدین کہہ رہے تھے۔ کبرت کلمة تخرج من افواههم،

قرآن مجید کو اللہ تعالےٰ نے تھوڑا تھوڑا نازل فرمایا، پھر اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کیا، اور اس کے توضیح طلب مقامات کی تشریح فرمائی، جیسا کہ سورۂ قیامہ میں آیا ہے۔ ان علینا جمعه و قرآنه۔

آگے چل کر امام سیوطی کا قول نقل کرتے ہیں

" پہلے شخص جنہوں نے اپنے علم مناسبت (علم نظم) کو ظاہر کیا شیخ ابوبکر نیشاپوری ہیں۔ وہ قرآن کی آیتوں کی شرح کرتے اور بتاتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں آیت کے پہلو میں کیوں رکھی گئی اور فلاں سورہ کے پہلو میں کیوں رکھی

---

[1] تفسیر نظم القرآن مولانا حمید الدین فراہی، طبع اول ص ۶

گئی، اور فلاں سورہ کے فلاں سورہ کے ساتھ رکھنے میں کیا حکمت ہے"۔

ہمارے یہاں کے علماء میں فراہی نے نظم قرآن پر بڑی توجہ دی ہے، اور نہ صرف آیات میں ربط کا کھوج لگایا ہے بلکہ سورتوں میں باہمی مناسبت کی بھی نشان دہی کی ہے، سورہ والعصر کی تفسیر کے سلسلہ میں اس سورہ کا تعلق ماقبل اور مابعد کی سورتوں سے ظاہر کیا ہے، یہ تین آیتوں کی سورہ ہے، اس کے پہلے سورہ تکاثر آٹھ آیتوں کی اور مابعد کی سورۂ ہمزہ نو آیتوں کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سورتوں کا نظم تعداد آیات کے لحاظ سے تو نہیں ہے، مولانا فراہی فرماتے ہیں :-

"سورہ تکاثر میں یہ بات بیان ہوئی تھی کہ ارباب نعمت وجاہ طلب مال و عیش دنیا کی خود فراموشیوں میں گم ہیں، ان کی زندگی اور زندگی کی تمام سرگرمیوں کا محور بس دنیا ہے جس کے عشق میں انہوں نے اپنی عمریں گنوا دیں، حالانکہ اس سے بڑھ کر کوئی بدبختی و نامرادی نہیں . . .

والعصر ابتدا تے سورہ میں ان لوگوں کی نامرادی کو بیان کیا ہے، جو عشق دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ پھر اصل کامیابی کی طرف اشارہ کیا کہ اس عمر فانی کے اندر نیکی اور سچائی کی زندگی بسر کر کے یہ دولت جاوداں حاصل کی جا سکتی ہے، پس لوگوں کو چاہیئے کہ وقت کی قدر کریں اور غفلت و سرمستی کی نیند سے بیدار ہو کر حسرت و افسوس کی ساعت سے پہلے اس چیز کی سعی و طلب میں مشغول ہوں جو چاہنے کی ہے

بعد والی سورہ ہمزہ میں اس عذاب کی تصویر کھینچی گئی ہے، جس میں یہ ارباب نعمت مبتلا ہوں گے، البتہ یہ سورہ ان دونوں سورتوں کے درمیان رکھی گئی تاکہ ان کی آرزوؤں کی نامرادی اور کوششوں کی بربادی پر تنبیہ فرمائی جائے"[1]

مولانا بحر العلوم شرح مسلم میں لکھتے ہیں "قرآن کی یہ ترتیب جس پر وہ آج ہے، آنحضرت صلعم سے ثابت ہے، اس لیے کہ ان دس قاریوں نے جن کی فہرست قرأت اسلامی دنیا میں بالاتفاق مقبول ہے، ایسی صحیح سندوں سے جس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے، قرآن کو اس ترتیب سے نقل کیا"

یہ چند رائیں ہیں جو مشتے نمونہ از خروارے، صرف اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے پیش کی گئی ہیں کہ جن لوگوں نے عمریں کلام مجید پر غور و خوض میں صرف کی ہیں وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ نظم قرآن میں سورتوں کی ترتیب محض اندازہ سے نہیں ہے بلکہ ایک بلند و بالا اسکیم کے ماتحت ہے، اور یہ رائیں ایسی نہیں جنہیں سرسری طور پر نظر انداز کر دیا جائے۔

(باقی ہے)

---

[1] تفسیر سورہ والعصر، طبع اول ص ۶ - ۸ - ۳

بقیہ : مولانا حمید الدین فراہیؒ

(صفحہ ۴۰ سے آگے)

تصرفات عام ہیں مثلاً اَمّ اور ھَمّ ۔ ھبّ اور تأھب ۔ پس ابّ درحقیقت ھبّ کی ایک شکل ہے۔ عربی میں اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں مثلاً ھَزَّ اور اَزَّ ، اراق اور ھراق۔ اس کے بعد شاداب گھاس کو ابّ کہنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں "شاداب گھاس کو ابّ اس لئے کہتے ہیں کہ بارش کے بعد یہ سب سے پہلے نمودار ہوتی ہے۔ پہلے نمودار ہونے کے باعث ہی ابان النبات کا لفظ پیدا ہوگیا۔ پھر کسی قدر توسیع کرکے ابان الشباب بھی بولنے لگے جس کی مناسبت ظاہر ہے۔ پھر ابان کا لفظ ہر چیز کے اول وقت کے لئے استعمال ہونے لگا۔ یہ مادہ عربی کی بہن عبرانی زبان میں بعینہٖ اسی معنی میں پایا جاتا ہے zzx (ابب) zx (اب) ترکاری اور پھل 2x 2S (ابیب) سبزبالی۔ اس تفصیل سے یہ واضح ہوا کہ اس مادّہ سے عرب واقف ہیں لیکن اشعار میں اس کا استعمال اس لئے کم ہے کہ لغت میں اس کے ہلکے مترادفات موجود ہیں۔

اس کتاب پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ امام فراہیؒ کو عربی زبان پر کتنی قدرت حاصل تھی اور وہ عرب کے فصحا کے اسالیب کلام سے کس قدر واقف تھے۔ (اگلے صفحہ پر مسلسل)

کراچی میں

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کی جملہ مطبوعات بشمول ماہنامہ "میثاق"

کے لیے

دفتر انجمن خدّام القرآن کراچی

۳۳/۲ فرید چیمبرز، سر عبداللہ ہارون روڈ (نزد ہوٹل جبیس)

سے رجوع فرمائیں

(فون : ۵۱۰۵۴۶)

۴۔ جمہرۃ البلاغہ | اس کتاب میں مولانا فراہیؒ نے علم بلاغت کے بارے میں اپنی رائیں اور نظریات واضح کئے ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن مجید، شعرا کے اسالیب کلام اور زمانۂ جاہلیت عہدِ رسالت اور عرب و عجم کے اختلاط سے پہلے کے ادیبوں کے کلام کی روشنی میں بلاغت کے پرکھنے کے نئے اصول وضع کئے ہیں۔

مولانا فراہیؒ کو ان کوششوں کا اندازہ اور احترام ہے جو اہل فن نے عربی زبان کی بلاغت کے اصول وضع کرنے میں صرف کی ہیں لیکن ان کی رائے یہ ہے کہ ان اصول کا بڑا حصہ اس یونانی کلام سے ماخوذ ہے جو ترجمہ ہو کر عربی میں رائج ہوا۔ اس وجہ سے اس کی بنیاد پر قرآن مجید کے محاسن اور کلام عرب کی بلاغت کی خوبیوں کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اس رائے کی دلیل یہ ہے کہ عربی زبان کے اسالیب کا پہلا ناقد قدامہ بن جعفر کو سمجھا جاتا ہے اور یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے اصول کا بڑا حصہ ادب یونانی سے حاصل کیا اور کلام کی خوبی کی بنیاد جھوٹ کو قرار دیا نیز اس نے معنی و مفہوم کے بجائے کلام کے وزن اور زیر و بم کو اصل اہمیت دی۔ یہ چیز اسلامی ادب کی روح کے سراسر خلاف ہے۔ جب ہم قدامہ کی کتاب 'نقد الشعر' کا ارسطو کی کتاب 'شعر' سے مقابلہ کرتے ہیں تو دونوں میں بڑی مماثلت نظر آتی ہے۔ ارسطو نے کلام کے نقد کے اصول یونانی شاعر سوفاکلیس کے کلام کی روشنی میں وضع کئے جس کا معمول لوگوں سے خلاف حقیقت چیزیں بیان کرنا تھا۔ اس کے برعکس عربی فن بلاغت اس بنیاد پر قائم ہے جسے طرفہ بن العبد بکری نے اپنے شعر میں یوں بیان کیا ہے۔

وان احسن بیت انت قائلہ　　بیت یقال اذا انشدتہ صدقا

(نیز سب سے اچھا شعر وہ ہے جسے تو پڑھے تو لوگ کہہ اٹھیں کہ اس نے سچ کہا)

مولانا فراہیؒ کے پیش نظر یہ بات ہے کہ بلاغت کے اصولوں کو اس ادب اسلامی کی روشنی میں وضع کیا جائے جس کا نمونہ قرآن مجید اور حدیث شریف نے پیش کیا ہے اس میں تو شک نہیں کہ اس ادب میں بھی کلام کے وزن کا خیال رکھا گیا ہے لیکن اس میں اصل اہمیت معنی کو دی گئی ہے۔ مولانا فراہیؒ یہ دعوت دیتے ہیں کہ فن بلاغت کو ایک ایسے فن کی حیثیت سے پڑھا جائے جس میں قلب و روح کے لئے سامان ہو نہ اس طرح کہ منطق و فلسفہ کے طرز پر اسے اٹھایا جائے اس لئے یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید، قدیم عربی اکابر شعرا اور ادیبوں کے کلام کو کثرت سے پڑھا جائے اور متاخرین شعرا کے کلام پر زیادہ توجہ نہ دی جائے جس میں بناوٹ کا پہلو آ گیا ہے۔

مولانا فراہیؒ کی رائے میں فن محض حصول لذت اور نفس کی بھوک مٹانے کا ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ یہ

اخلاقی اقدار کو رائج کرنے اور دلکش پیرائے میں شریفانہ تعلیمات دینے کا ذریعہ نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ لکھتے ہیں کہ "کلام کسی عاقل کے دل میں اس وقت تک جگہ نہیں پا سکتا جب تک اس کا مفہوم شریفانہ نہ ہو۔ اس بارے میں احمقوں اور بُرے لوگوں کے تاثر کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ چیزوں کو نام سلامتی حال کا خیال کرکے دیئے جاتے تھے اصل دل نشین چیز کلام کا معنی ہوتی ہے۔ الفاظ صرف اس کا مرکب ہوتے ہیں۔ حسن کلام پہ غور کرتے ہوئے معنی کا لحاظ ضروری ہے۔"

باقی کتابیں مذکورہ کتابوں کے علاوہ مولانا فراہیؒ نے اسلامی فکر کی روح کے بلند مقصد کو مدنظر رکھ کر اور بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن کے ناموں کے بیان پہ ہم کفایت کرتے ہیں :

۱ : اسالیب القرآن	۲ : اسباب النزول
۳ : احکام الاصول باحکام الرسول	۴ : الادیان والادیان
۵ : الامعان فی اقسام القرآن	۶ : اوصاف القرآن
۷ : التکمیل فی اصول التاویل	۸ : دلائل النظام
۹ : فقہ القرآن	۱۰ : الفائد الی عیون العقائد
۱۱ : کتاب الرسوخ فی معرفۃ الناسخ والمنسوخ	۱۲ : کتاب العقل وما فوق العقل
۱۳ : نوائے پہلوی (فارسی دیوان)	۱۴ : دیوان عربی

۱۵ : الرای الصحیح فی من ہو الذبیح

ان میں سے بعض کتابیں ہندوستان میں چھپ چکی ہیں باقی ابھی تک مسودات کی شکل میں ہیں۔

بقیہ ابوبکر صدیقؓ صفحہ ۶۴ سے آگے

کر دیا کہ میری وفات کے بعد وہی میرے جانشین ہوں گے۔ پیغمبرؐ کے اس انتخاب کی تصدیق تمام اکابر صحابہ نے کر دی پھر انجام کار اس انتخاب کو مستقل حیثیت دے دی اگرچہ علی نے شروع میں اختلاف کیا تھا مگر پھر سر تسلیم خم کر دیا۔"

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

تاریخ و سیرت

حضرت صدیق اکبرؓ غیروں کی نظر میں

از: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

یہ مضمون محترم پروفیسر صاحب نے 'سیرۃ صدیق اکبرؓ کانفرنس' منعقدہ برکت علی اسلامیہ ہال، لاہور بروز اتوار بتاریخ ۲۲ جولائی زیر صدارت جسٹس محمد صدیق صاحب آف لاہور ہائی کورٹ پڑھ کر سنایا ——— مدیر

صاحب صدر اور حاضرین مجلس

میرے لئے اس محفل میں شرکت بلاشبہ باعث سعادت ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی سیرۃ اس قدر پاکیزہ، دل کش اور بے عیب ہے کہ اغیار نے بھی ان کی عظمت ذاتی کا اعتراف کیا ہے اور بصمیم قلب انہیں خراج تحسین ادا کیا ہے۔

(۱) میں سب سے پہلے ہندوؤں کے مہاتما اور محسن اعظم مسٹر گاندھی کی رائے آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں گا۔ جب ۱۹۳۷ء میں ملاعنہ فرنگ نے ہند کے باشندوں کو صوبہ جاتی خود مختاری عطا کی تو گاندھی نے اپنی قوم کو مشورہ دیا تھا کہ ہندو قوم کو ۱۲۰۷ = ۱۹۴۷ = ۷۴۰ سال کے بعد آزادی ملنے والی ہے چونکہ وہ اس طویل مدت میں حکمرانی کے طور طریقے فراموش کر چکے ہیں اس لئے میں ان کو مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ 'ہجرت' ابوبکر اور 'ہجرت' عمر کے "اسوۂ حسنہ" کو پیش نظر رکھیں۔ کیونکہ تاریخ عالم ان سے بہتر حکمران ابھی تک ہمارے سامنے پیش نہیں کر سکی ہے۔ یہ مشورہ دینے کے بعد گاندھی نے دونوں بزرگوں کی پاکیزہ شخصیت کے بعض پہلوؤں کو نمایاں کیا تھا اور صدیق اکبرؓ کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ اس قدر درویش صفت تھے کہ خلیفہ بن جانے کے بعد بھی عوام کی سیوا اسی

طرح کرتے تھے جس طرح پہلے کرتے تھے۔

(۲) اس کے بعد عیسائی مصنفین کے خیالات پیش کرتا ہوں۔

فان کریمر (VON KRAMER) اپنی تالیف THE ORIENT UNDER THE CALIPHS میں لکھتا ہے:

ABU BAKR THE SUCCESSOR AND THE REPRESENTATIVE OF THE PROPHET IN THE HIGHEST AFFAIRS OF THE MUSLIM COMMUNITY WAS A SIMPLE MAN TO THE OLD ARABIAN FASHION AND WHEN SUMMONED OF THE CALIPHATE HE WAS CHANGED IN NO RESPECT.

مدینے کے نواح میں بمقام "سنح" نہایت سادگی سے رہتے تھے اور خلیفہ ہو جانے کے بعد سات ماہ تک روزانہ صبح کو ایسے وقت مدینے پہنچ جاتے تھے کہ مومنوں کو مجز کی نماز پڑھا سکیں۔ مدینے منتقل ہو جانے کے بعد بھی سادگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صرف ایک خادم تھا جو گھر کا کام کرتا تھا اور بوقت فرصت مجاہدین کی تلواروں کو صاف کرتا تھا۔

(۳) ایچ۔ جی ویلز (H. G. WELLS)

روح اسلام کا مجسمہ ظاہری آنحضرتؐ نہیں تھے بلکہ آپ کے جگری دوست اور معاون حضرت ابوبکرؓ تھے۔ اگر آنحضرت ابتدائی اسلام کا ذہن اور تخیل تھے تو ابوبکر اس کا ضمیر اور ارادہ تھے۔ دونوں کی زندگی ایک دوسرے کی رفاقت میں بسر ہوئی مگر اس طرح کہ محمدؐ نے جو بات بھی زبان سے نکالی ابوبکرؓ نے اس پر آمنا اور صدقنا کہا۔

محمدؐ کی وفات کے بعد ابوبکرؓ نے اس ایمان کا مظاہرہ کیا جس کی بدولت پہاڑ بھی اپنی جگہ سے سرک سکتا ہے۔ آنحضرتؐ نے ۶۲۸ء میں شاہان عالم کو اسلام کی دعوت دی تھی ابوبکرؓ نے اپنے آقا کی خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے فتوحات کا دروازہ کھول دیا اور اگر دنیائے اسلام میں ابوبکر کے پائے کے بیس آدمی اور ہوتے تو وہ ساری دنیا کو فتح کر لیتے۔

(۴) سائیکلو پیڈیا آف اسلام

"حضرت ابوبکرؓ کی سب سے بڑی خصوصیت وہ غیر متزلزل ایمان ہے جو وہ آنحضرتؐ کی رسالت پر رکھتے تھے۔ معراج اور صلح حدیبیہ کے موقع پر اپنے ایمان کی جس پختگی کا مظاہرہ انہوں

نے کیا اس کے صلے میں بقول ابن اسحاق انہیں الصدیق کا لقب حاصل ہوا اور یہ لقب آج تک ان کے نام کا جزو لاینفک بنا ہوا ہے۔

نہایت رقیق القلب اور حلیم الطبع تھے جب تلاوت کرتے تھے تو رقت طاری ہو جاتی تھی اور بقول حضرت عائشہ صدیقہؓ جب آنحضرتؐ نے ان سے کہا کہ تم ہجرت میں میرے رفیق سفر ہو گے تو فرط مسرت سے گریہ طاری ہو گیا۔ پیغمبر کی اخلاقی تعلیم کا ان پر بہت جلد اثر مرتب ہوتا تھا۔ جس کا ثبوت مسلمان غلاموں کو خرید کر آزاد کر دینے سے مل سکتا ہے۔

ابوبکر دین کی ترقی کے لئے ہمیشہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے آمادہ ہو جاتے تھے جب اسلام لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم نقد تھے لیکن بوقت ہجرت صرف ۵ ہزار رہ گئے تھے اور چلتے وقت انہیں بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ابوبکر نے قبول اسلام کے بعد ہجرت تک ہر نازک موقع پر اپنے آقا کا ساتھ دیا۔ ہر مصیبت کا رسول کے ساتھ شانہ بشانہ مردانہ وار مقابلہ کیا ان کی دنیاوی زندگی میں سب سے اعلیٰ مقام اس وقت آیا جب محمدؐ نے انہیں اپنا رفیق منتخب کیا اور اللہ نے ان کی ایثار آمیز رفاقت کو "ثانی اثنین اذ ھما فی الغار" کے لقب سے اسلام کی تاریخ میں غیر فانی بنا دیا۔

پیغمبر نے ۹ھ میں انہیں امیر الحج کا شرف عطا کیا اور میری تحقیق کے مطابق انہوں نے اعلان برأۃ لوگوں کو سنایا تھا نہ کہ حضرت علی نے۔ جب محمدؐ بیمار ہوئے تو انہوں نے ابوبکر کو نماز پڑھانے کا حکم دیا اور اسی نمایاں خصوصیت کی بنا پر عمرؓ اور ان کے احباب (مثلاً ابن عوف، ابن جراح، ابن ابی وقاص، طلحہ وغیرہ) نے سقیفہ میں ابوبکر کو خلیفۃ المسلمین منتخب کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔

چونکہ دین میں وہ کسی بدعت کے قائل نہیں تھے اور ان کی سیرت نہایت مستقیم تھی اس لئے وہ محمد ثانی یا مجسم محمد بن گئے۔ انہوں نے مسلمانوں کی جماعت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا اور تمام خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اپنی وفات کے وقت امت کو ایسی مستحکم حالت میں چھوڑا کہ اس نے عمر کے زمانے میں ان کی حکومت کو سہارا دیا۔ ابوبکر نے اطاعت رسول کا بہترین نمونہ اس وقت پیش کیا جب انہوں نے نازک حالات کے باوجود جیش اسامہ کو روانہ کر دیا۔ ابوبکر نے بنو حنیفہ کو مغلوب کر کے اور مطیع اسلام کر کے وہ کارنامہ انجام دیا جو اُن کے آقا بھی انجام نہیں دے سکے تھے۔

خلیفہ ہو کر بھی ابوبکرؓ نے اپنی سادگی کو برقرار رکھا۔ مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں ابوبکرؓ نے قرآن کے اس حکم کو ہمیشہ مدنظر رکھا کہ سب مومن برابر کے حصہ دار ہیں۔ احادیث صحیحہ میں ان کی سادگی اور ان کے زہد و اتقا کے بہت سے واقعات موجود ہیں۔ انہوں نے اپنے عہدے سے کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا اور مالدار ہونے کی کبھی تمنا نہیں کی[1]

(۵) اسٹینلی لین پول (STUDIES IN A MOSQUE) میں لکھتا ہے " ابوبکرؓ کی سنجیدہ قوت فیصلہ اور محبت و شفقت سے لبریز دل یہ دو خوبیاں اسلام کی ترقی کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئیں "

(۶) سائمن اوکلے HISTORY OF SARACENS میں لکھتا ہے۔ " ابوبکرؓ نے بیت المال میں کبھی رقم جمع نہیں ہونے دی۔ ہر جمعہ کو نماز سے قبل جس قدر رقم ہوتی تھی سب مستحق افراد میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ان کی صفات عفت و عصمت، زہد و ورع اور زخارف دنیوی سے بے تعلقی قابل تقلید تھیں۔ قبل وفات انہوں نے اپنی بیٹی عائشہؓ سے کہا کہ جس قدر رقم میں نے بحیثیت خلیفۃ المسلمین بیت المال سے لی ہے سب میرے ذاتی اثاثے کو فروخت کر کے واپس کر دو۔ چنانچہ جب عمرؓ نے یہ بات سنی تو کہا " ابوبکرؓ نے اپنے جانشین کے سامنے نہایت دشوار نمونہ پیش کیا ہے "

(۷) ایڈورڈ گبن لکھتا ہے جب ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے اپنی بیٹی عائشہؓ سے کہا کہ جدی جائداد کا گوشوارہ مرتب کر لو تاکہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ ابوبکرؓ نے بیت المال میں ناجائز تصرف کر کے جائداد میں اضافہ کر لیا ہے۔ وہ صرف تین درہم روزانہ اپنے خانگی اخراجات کے لئے لیتے تھے۔ صرف ایک اونٹ اور ایک حبشی غلام ان کی ملکیت تھا اس کے باوجود ہر جمعہ کو وہ ذاتی پس ماندہ رقم اور بیت المال کی ساری رقم خیرات کر دیتے تھے۔ جب ان کی وفات کے بعد ان کا کل ترکہ جو ایک موٹے کرتے اور چادر اور پانچ درہم پر مشتمل تھا، عمرؓ کے حوالے کیا گیا تو انہوں نے آہ سرد

---

[1] ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضرت صدیق اکبرؓ کو یہ مشورہ دیا کہ وظائف سابقون لاحقون سے زیادہ ہونے چاہئیں۔ اس پر صدیق اکبرؓ نے فرمایا سبقت الی الاسلام سے میں بھی واقف ہوں مگر یہ تو وہ چیز ہے جس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ یہاں اس دنیا میں تو معاش کا معاملہ ہے اور اس میں سابق اور لاحق سب برابر ہیں لہٰذا یکسانیت ترجیح سے بہتر ہے۔

بھر کر کہا "میں اُن کے نقش قدم پر نہیں چل سکتا"

(۸) ڈاکٹر وآل A HISTORY OF THE ISLAMIC PEOPLES میں لکھتا ہے "ابوبکر کی نجی زندگی بھی اُسی طرح پاکیزہ اور اعتراضات سے بالاتر تھی جس طرح ان کی پبلک زندگی۔ اس کے سوا ان پر کوئی نکتہ چینی نہیں ہوسکتی کہ وہ خالد پر غیر معمولی طور سے مہربان تھے مگر یہ طرز عمل بھی ان کی سیاسی حکمت عملی اور دانش مندی پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے مال غنیمت ہمیشہ صرف سلطنت کی بہبود پر خرچ کیا۔ خود کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا وہ خلیفہ ہوکر بھی اسی طرح غریب رہے جس طرح پہلے تھے (وہ اپنی ساری دولت اسلام پر قربان کر چکے تھے۔ انہوں نے صحابہ کے اصرار شدید پر چند ہزار درہم سالانہ بطور وظیفہ قبول کیا تھا وہ مہربان، سادگی پسند اور بہت متورع تھے"

(۹) اندرے سرویئر (ANDRE SERVIER) لکھتا ہے:-

ISLAM AND THE PSYCHOLOGY OF THE MUSALMANS

"ابوبکر بہت سادگی پسند تھے اور خلیفہ بن جانے کے باوجود انہوں نے غربت کی زندگی بسر کی۔ جب وفات پائی تو ترکے میں صرف ایک بوسیدہ قمیص ایک غلام اور ایک اونٹ چھوڑا۔ وہ حقیقی معنی میں اپنی قوم کے شیخ اور سردار تھے۔ اہل مدینہ کے محبوب تھے۔ ایک خوبی ان میں سب خوبیوں پہ بھاری تھی اور وہ سخت جفاکشی تھی۔ ان کی فتوحات کا سرچشمہ وہ دو صفات تھیں جو ان کے دشمنوں میں نہیں تھیں۔ ایک تو ایمان باللہ جسے کوئی طاقت نہیں ہلا سکتی تھی، دوسری اسلام کی حقانیت پہ پختہ یقین۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ صحیح مقام پہ صحیح آدمی تھے انہوں نے محمدؐ کے کام کو از سر نو شروع کر کے پایۂ تکمیل تک پہنچایا"

(۱۰) سر ولیم میور لکھتا ہے:-

"جب ابوبکر بستر مرگ پر تھے تو ان کے ضمیر نے انہیں ملامت کی کہ بیت المال سے بقدر ضرورت وظیفہ بھی کیوں لیا؟ لہذا انہوں نے حکم دیا کہ میری فلاں جائداد بیچ کر وظیفے کی کل رقم بیت المال میں واپس کر دی جائے۔

سیرت کے اعتبار سے ابوبکر نہایت رقیق القلب اور شریف النفس تھے اسی رقت قلبی کی بنا پر ان کا لقب الأوّاہ پڑ گیا تھا یعنی بہت زیادہ آہ بھرنے والا۔ انہوں نے ساری عمر کسی پر ظلم نہیں کیا۔ دن میں معاملات خلافت انجام دیتے تھے۔ رات کو غریبوں اور مسکینوں کی خفیہ طور پر

خدمت کرتے تھے۔ ایک رات حضرت عمرؓ مدینے کی ایک ضعیف اور نابینا بیوہ کی خدمت کے لئے گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ابوبکر ان سے پہلے پہنچ کر ان کی خدمت میں مشغول ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ابوبکر بہت نرم دل تھے مگر ضرورت کے وقت نہایت مستقل مزاجی کا ثبوت دیتے تھے۔ مثلاً سب نے منع کیا مگر انہوں نے جیش اسامہ کو روانہ کر کے ہی دم لیا حالانکہ اس وقت مدینے میں فوج کی اشد ضرورت تھی۔ آنحضرتؐ کی اطاعت کا جذبہ اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے سب صحابہ سے کہہ دیا کہ جس علم کو آنحضرت نے لہرا دیا ہیں اس کو ہرگز نہیں لپیٹوں گا۔

ابوبکر کو استعلائے نفس کا مطلق خیال نہ تھا اگرچہ وہ مطلق العنان تھے مگر انہوں نے اپنے اقتدار کو اسلام کی بہبود کے لئے استعمال کیا۔ لیکن ان کی غیر معمولی قوت کا راز محمدؐ پر ایمان میں مضمر تھا۔ ان کے سامنے ہمیشہ ایک ہی مسئلہ رہتا تھا اور وہ یہ کہ اس معاملے میں جو اس وقت میرے سامنے ہے اگر آنحضرتؐ ہوتے تو کیا کرتے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس اصول سے وہ بال برابر ادھر یا اُدھر نہیں ہوئے۔ اسی جذبے کی بدولت وہ فتنہ ارتداد کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔ اور اسلام کی بنیادوں کو دوبارہ مستحکم کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگرچہ ان کا عہد حکومت بہت مختصر تھا مگر پیغمبر کے بعد، دین اسلام اپنی بقا کے لئے ان سے زیادہ کسی شخص کا ممنون احسان نہیں ہے۔

ان کا محمدؐ پر ایسا پختہ ایمان خود محمدؐ کے خلوص پر زبردست شہادت ہے۔ اگر محمدؐ نے اپنی نبوت کا آغاز فریب سے کیا ہوتا تو وہ اُس شخص (یعنی ابوبکر) کی حمایت اور دوستی اور رفاقت حاصل کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے جو انتہائی دانش مند اور زیرک ہی نہیں تھا بلکہ جس نے اپنی ساری زندگی ایمانداری، خلوص اور سادگی میں بسر کر دی

THE CALIPHATE BY W. MUIR P 78-81

(۱۱) سائیکلوپیڈیا بریطانیکا جلد اوّل صفحہ ۹۹

"چونکہ ابوبکر کا ایمان محمدؐ کی رسالت پر نہایت پختہ اور مستحکم تھا اس نے انہیں الصدّیق کا لقب حاصل ہو گیا۔ رسول سے مخصوص اتفاق میں انہوں نے انتہائی قدر دانی اور سچی عقیدت کا ثبوت دیا ان کا ایمان غیر متزلزل تھا۔ بوقت ہجرت صرف وہی رفیق پیغمبر تھے اور رفاقت کا یہ شرف انہیں پیغمبر کی وفات تک مسلسل حاصل رہا۔

• بحالت مرض الموت پیغمبرؐ نے ابوبکرؓ کو امامت صلوٰۃ کا حکم دے کر ور اصل اس طرف اشارہ

باقی صفحہ ۵۸ کے نیچے

مسلمانوں کی

حیاتِ ملّی

اور

ہیئتِ اجتماعی

کے بنیادی اصول

سورۂ

الحجرات

کی روشنی میں

(مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا ایک باب)

از قلم

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الحجرات اجتماعیات انسانی کے ذیل میں عام سماجی و معاشرتی معاملات سے بلند تر سطح پر نہ صرف قومی و ملی امور سے بحث کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی تاسیس اور تشکیل کن بنیادوں پر ہوتی ہے اور اس میں اتحاد و اتفاق اور یک جہتی و ہم آہنگی کیسے برقرار رکھی جا سکتی ہے بلکہ سیاست و ریاست کے متعلق امور سے بھی بحث کرتی ہے کہ اسلامی ریاست کس بنیاد پر قائم ہوتی ہے، اس کا دستور اساسی کیا ہے، اس کی شہریت کیسے حاصل ہوتی ہے اور اس کا دنیا کے دوسرے معاشروں یا اس کی دوسری ریاستوں سے تعلق کن بنیادوں پر استوار ہوگا۔

اس صورت کو بغرض تفہیم تین حصوں میں منقسم سمجھنا چاہیئے :-

پہلا حصہ مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے 'اصل الاصول' یعنی اسلامی ریاست کے دستور اساسی اور ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی[1] کے اصل قوام یعنی "مرکزِ ملت" سے بحث کرتا ہے۔

چنانچہ پہلی ہی آیت نے غیر مبہم طور پر واضح کر دیا کہ مسلمان معاشرہ اور اسلامی ریاست 'مادر پدر آزاد' نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے 'پابند' ہیں اور مسلمانوں کی آزادی کے معنی صرف یہ ہیں کہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے لئے دوسری ہر طرح کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گویا یہ ایک فرد کی طرح اجتماعیت بھی صرف وہی 'مسلمان' قرار دی جا سکتی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تشبیہ کے مطابق اسی طرح اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے ساتھ بندھی ہوئی ہو جیسے ایک گھوڑا اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ آیت مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کے اصل الاصول یعنی ایک اسلامی ریاست کے دستور اساسی میں حاکمیت سے متعلق اوّلین دفعہ کو متعین کر دیتی ہے کہ یہاں حاکمیت نہ کسی فرد کی ہے نہ طبقے کی نہ قوم کی ہے نہ جمہور کی بلکہ صرف خدا کی ہے (اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ) اور اسلامی ریاست کا کام (FUNCTION) صرف یہ ہے کہ رسول کی تشریح و توضیح کے مطابق خدا کی مرضی و منشا کو پورا کرے۔

آیت کے اخیر میں اس اطاعت کی اصل روح کی جانب بھی اشارہ کر دیا گیا ہے یعنی تقویٰ اللہ۔

---

[1] کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے — یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

[2] حاشیہ اگلے صفحہ پر

اس کے بعد مسلمانوں کی ہئیت اجتماعی کی اصل ثانی کو واضح کیا گیا جس کے گرد مسلمانوں کی حیاتِ ملی کی اصل شیرازہ بندی ہوتی ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب آپؐ کی تعظیم و توقیر آپؐ سے محبت اور عشق اور آپؐ کے مقام و مرتبہ سے آگاہی (وَاعْلَمُوا اَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللّٰهِ) اور پھر اس قول و فعل یا رویے اور برتاؤ سے کامل اجتناب جس سے ادنیٰ ترین درجے میں بھی گستاخی یا تحقیر و توہین کا پہلو نکلتا ہو (ع "ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر!") جیسے مثلاً آپؐ کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کر دینا یا آپؐ کو حجرہ مبارک کے باہر سے آوازیں دینا وغیرہ۔

مسلمانوں کی ہئیت اجتماعی کی ان دو بنیادوں میں سے پہلی چونکہ عقیدۂ توحید فی الالوہیت کا لازمی نتیجہ ہے اور اس اعتبار سے گویا قرآن حکیم کے ہر صفحے پر بعلا جلی اس کا ذکر موجود ہے لہٰذا اس مقام پر اس کا ذکر صرف ایک آیت میں کر دیا گیا۔ اس کے مقابل اصل ثانی پر انتہائی زور دیا گیا اور بعض متعین واقعات پر گرفت اور سرزنش کے ضمن میں واضح کر دیا گیا کہ ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست!
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است!!

اس لئے کہ حقیقت یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں ملتِ اسلامیہ کے پاس وہ 'مرکزی شخصیت' موجود ہے جس سے تمدنِ انسانی کی وہ فطری ضرورت بتمام وکمال اور بغیر تصنع و تکلف پوری ہو جاتی ہے جس کے لئے دوسری قوموں کو باقاعدہ تکلف و اہتمام کے ساتھ شخصیتوں کے بت تراشنے اور 'ہیرو' (HEROES) گھڑنے کا کھکھیڑ مول لینا پڑتا ہے مزید برآں دنیا کی دوسری اقوام تو ع "ہمی تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر!" کے مصداق مجبور ہیں کہ ہر دور میں ایک نئی شخصیت کا بت تراشیں لیکن ملتِ اسلامیہ کے پاس ایک دائم و قائم 'مرکز' موجود ہے جو اس کے ثقافتی تسلسل (CULTURAL CONTINUITY)

؎ حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ: واضح رہے کہ پاکستان میں پہلے بھی دو دفعہ بار بار دستوری مسودے تیار ہوئے ان سب میں یہ دفعہ ان الفاظ میں موجود رہی ہے کہ "یہاں کوئی قانون سازی کتاب و سنت کے خلاف نہیں کی جائے گی" لیکن ہر بار یہ چور دروازہ رکھا گیا کہ یہ دفعہ دستور کے واجب التنفیذ دفعات (OPERATIVE CLAUSES) میں شامل نہیں کی گئی بلکہ صرف رہنما اصولوں (DIRECTIVE PRINCIPLES) میں درج کی گئی اور اب بھی ——— اگرچہ دستور میں یہ دفعہ موجود ہے لیکن اس پر عمل کو فی الحال مؤخر کر دیا گیا ہے۔

کا ضامن ہے۔ (اس اعتبار سے دیکھا جائے تو " اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ " میں خطاب صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی سے نہیں بلکہ تا قیام قیامت پوری اُمّتِ مسلمہ سے ہے!) اس دوام اور تسلسل کے ساتھ ساتھ اُمّت مسلمہ کی وسعت اور پھیلاؤ پر بھی نگاہ رہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی 'مرکزیت' ہی کا ثمرہ ہے کہ مشرق اقصیٰ سے لے کر مغرب بعید تک پھیلی ہوئی قوم میں نسل و لسان کے شدید اختلاف اور تاریخی و جغرافیائی عوامل کے انتہائی بُعد کے علی الرغم ایک گہری ثقافتی یک رنگی (CULTURAL HOMOGENIETY) موجود ہے اور اسی کی فرع کے طور پر اس حقیقت پر بھی ہمیشہ متنبہ رہنا چاہیئے کہ مختلف مسلمان ممالک میں علیحدہ علیحدہ قیادتوں اور 'علاقائی شخصیتوں' کو بس ایک حد تک ہی ابھارنا چاہیئے۔ اس سے تجاوز کی صورت میں اس سے 'وحدتِ ملت' کی جڑیں کمزور ہونے کا اندیشہ ہے گویا بقول علامہ اقبال ؎

سالار کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

اور ——— یہ زائرین حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں

روئے زمین کی تمام مسلمان اقوام کو معیار قیادت ایک ہی رکھنا چاہیئے اور وہ ہے ذات محمدؐ فداہ ابی و امی صلی اللہ علیہ وسلم۔

مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی متذکرہ بالا دو بنیادوں میں سے پہلی زیادہ تر عقلی و منطقی ہے، اور دوسری نسبتاً جذباتی، پہلی پر دستور و قانون کا دار و مدار ہے اور دوسری پر تہذیب و ثقافت کی تعمیر ہوتی ہے اور ان دونوں کا باہمی رشتہ ایک دائرے اور اس کے مرکز کا ہے۔ مسلمان اجتماعیت اس دائرے میں محصور ہے جو خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام نے کھینچ دیا ہے اور اس کے مرکز کی حیثیت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دلنواز اور دلآویز شخصیت کو حاصل ہے جن کے اتباع کے جذبے سے اس ہئیت اجتماعی کو ثقافتی یکرنگی نصیب ہوتی ہے اور جن کی محبت کے رشتے سے اس کے افراد ایک مرکز سے بھی وابستہ رہتے ہیں اور باہم دگر بھی جڑے رہتے ہیں۔

(اب اس معذرت کے ساتھ آگے چلتا ہوں کہ مقامِ رسالتؐ کے ذکر میں طول کلام فی الواقع " لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!" کے مصداق ہے)

دُوسرا حِصّہ ان احکامات پر مشتمل ہے جن پر عمل پیرا ہونے سے ملّت اسلامیہ کے افراد اور گروہوں

اور جماعتوں کے مابین رشتۂ محبّت و الفت کے کمزور ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں اور اختلاف و انتشار اور فتنہ و فساد کو بڑھنے سے روکا جا سکتا ہے۔ ان احکام کو بھی مزید دو عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک[1] وہ اہم تر احکام جو وسیع تر پیمانے پر گروہوں کے مابین تصادم سے بحث کرتے ہیں اور دوسرے[2] وہ بظاہر چھوٹے لیکن حقیقۃً نہایت بنیادی احکام جو خالص انفرادی سطح پر نفرت اور عداوت کا سدّباب کرتے ہیں۔

مقدّم الذکر احکام دو ہیں: ۱۔ افواہوں کی روک تھام اور کسی حتمی فیصلے اور عملی اقدام سے قبل اچھی طرح تحقیق و تفتیش اور چھان بین کا اہتمام[1] اور ۲۔ نزاع کے واقع ہو جانے کی صورت میں صحیح طرزِ عمل —— یعنی ا: یہ کہ فریقین کے مابین صلح کرانے کو اجتماعی ذمّہ داری اور معاشرتی فرض سمجھا جائے) گویا کہ لاتعلقی (INDIFFERENCE) کی روش کسی طور صحیح نہیں) ب: اس کے بعد بھی اگر ایک فریق زیادتی ہی پر مصر رہے تو اب اس کا مقابلہ صرف فریقِ ثانی ہی کو نہیں پوری ہئیت اجتماعیہ کو کرنا چاہئے اور ج: جب وہ گردن جھکا دے تو از سرِ نو عدل و قسط پر مبنی صلح کرا دی جائے (اس مقام پر عدل اور قسط کا مکرّر و مؤکد ذکر خاص طور پر اس لئے ہے کہ جب پوری ہئیت اجتماعیہ اس فریق سے ٹکرائے گی تو فطری طور پر اس کا امکان موجود ہے کہ دوبارہ صلح میں اس فریق پر غصّے اور جھنجھلاہٹ کی بنا پر زیادتی ہو جائے!)

مؤخر الذکر احکام چھ نواہی پر مشتمل ہیں یعنی ان میں ان چھ معاشرتی برائیوں سے منع فرمایا گیا ہے جن کے باعث بالعموم دو افراد یا گروہوں کے مابین رشتۂ محبّت و الفت کمزور پڑ جاتا ہے اور اس کی جگہ نفرت و عداوت کے بیج بوئے جاتے ہیں اور ایسی کدورت پیدا ہو جاتی ہے جو پھر کسی طرح نہیں نکلتی اس لئے کہ عام ضرب المثل کے مطابق تلواروں کے گھاؤ بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے! وہ چھ چیزیں یہ ہیں۔ ۱۔ تمسخر (اس کے سدّباب کے لئے اس نہایت گہری حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے صرف ظاہر کو دیکھتا ہے اور اسی کی وجہ سے تمسخر کا مرتکب ہو بیٹھتا ہے حالانکہ اصل چیز انسان کا باطن ہے اور خدا کی نگاہ میں انسانوں کی قدر و قیمت ان کے باطن کی بنیاد پر ہے) ۲۔ عیب جوئی اور تہمت (اس کے ذیل میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ جب سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں تو کسی دوسرے مسلمان کو عیب لگانا گویا خود اپنے آپ کو عیب لگانا ہے) ۳۔ تنابز بالالقاب۔ یعنی لوگوں یا گروہوں کے توہین آمیز نام رکھ لینا (اس کے ضمن میں اشارہ فرمایا کہ اسلام لانے کے بعد برائی کا نام بھی نہایت بُرا ہے) ۴۔ سوءِ ظن (اس لئے کہ بہت

---

[1] اس سلسلے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے یہ الفاظ مبارک مستحضر رہنے چاہئیں کہ "کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ" ایک شخص کے جھوٹے ہونے کے لئے یہ بات بالکل کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اسے آگے بیان کر دے (یعنی آگے بیان کرنے سے قبل اس کی صحت کی تحقیق و تصدیق نہ کرے!)

ہے ظن گناہ کے درجے میں ہیں) ۵۔ تجسس اور ۶۔ آخری اور اہم ترین، غیبت جس کی شناعت کے اظہار کے لئے حد درجہ بلیغ تشبیہ اختیار کی یعنی یہ کہ کسی مسلمان کی غیبت ایسی ہے جیسے کسی مردہ بھائی کا گوشت کھانا (اس لئے کہ جس طرح ایک مردہ اپنے جسم کا دفاع نہیں کر سکتا اسی طرح ایک غیر موجود شخص بھی اپنی عزت کے تحفظ پر قادر نہیں ہوتا)

الغرض ان آٹھ اوامر و نواہی سے مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کا استحکام مطلوب ہے اس لئے کہ جس طرح بڑی سے بڑی فصیل بھی بہر حال اینٹوں ہی سے بنی ہوتی ہے اور اس کے استحکام کا دار و مدار جہاں اینٹوں کی پختگی اور مضبوطی پر ہوتا ہے وہاں اینٹوں کو جوڑنے والے کسی گارے یا چونے یا کسی دیگر مسالے (CEMENT SUBSTANCE) کی پائداری پر بھی ہوتا ہے اسی طرح ملت اسلامیہ کے استحکام کے لئے بھی جس قدر مسلمانوں میں سے ہر ہر فرد کا سیرت و کردار کے اعتبار سے پختہ ہونا ضروری ہے اسی قدر ان کے مابین رشتہ محبت و الفت کی استواری بھی لازمی ہے۔ یہ البتہ واضح رہے کہ ملت اسلامیہ کا استحکام عام قومی تصورات کے تحت دنیوی غلبہ و اقتدار کے لئے نہیں بلکہ اس لئے مطلوب ہے کہ وہ "ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے" کے مصداق خدا کی زمین پر خدا کی مرضی پوری کرنے کا ذریعہ اور آلہ (INSTRUMENT) ہے!

تیسرا حصہ دو انتہائی اہم مباحث پر مشتمل ہے۔

۱: پہلی بحث انسان کی عزت و شرف کے معیار سے متعلق ہے جس کے ذیل میں واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان کی عزت و ذلت یا شرافت و رذالت کا معیار نہ کنبہ ہے نہ قبیلہ، نہ خاندان ہے نہ قوم، نہ رنگ ہے نہ نسل، نہ ملک ہے نہ وطن، نہ دولت ہے نہ ثروت، نہ شکل ہے نہ صورت، نہ حیثیت ہے نہ وجاہت، نہ پیشہ ہے نہ حرفہ اور نہ مقام ہے نہ مرتبہ بلکہ صرف "تقویٰ" ہے اس لئے کہ پوری نوع انسانی ایک ہی خدا کی مخلوق بھی ہے اور ایک ہی انسانی جوڑے (آدم و حوا) کی اولاد بھی۔

یہ بحث فی نفسہ بھی نہایت اہم ہے اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں بدامنی اور انتشار اور انسانوں کے مابین تصادم اور ٹکراؤ کا بہت بڑا سبب نسل اور نسب کا غرور ہی ہے اور یہ قومی و گروہی مفاخرت ہی ہے جو بین الانسانی منافرت کا اصل سبب بنتی ہے (اس سلسلے میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن بھی معترف ہیں کہ آپؐ نے واقعتاً انسانی عزت و شرف کی متذکرہ بالا تمام غلط بنیادوں کو منہدم کر دیا۔[1]

---

[1] چنانچہ مسٹر ایچ جی ویلز (H. G. WELLS) نے اپنی "مختصر تاریخ عالم" میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کے ذیل میں واضح طور پر اقرار کیا ہے کہ انسانی مساوات اور اخوت کے نہایت اونچے وعظ تو اگرچہ مسیح ناصری (علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے یہاں بھی موجود ہیں لیکن ان بنیادوں پر تاریخ میں پہلی بار ایک معاشرے کا واقعی قیام صرف محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم و فداہ ابی و امی) کا کارنامہ ہے۔

اور انسانی مساوات اور اخوّت کی بنیاد پر ایک معاشرہ عملاً قائم فرما دیا!) لیکن خاص طور پر اس مقام پر اس بحث کے دو رُخ لائقِ توجہ ہیں —— ایک: یہ کہ اوپر جن سماجی برائیوں سے منع فرمایا گیا تھا مثلاً تمسخر و استہزاء اور عیب جوئی و بدگوئی ان کی جڑ میں جو گمراہی کارفرما ہے وہ اصل میں یہی نسل و نسب کی بنیاد پر تفاخر و تباہی کا جذبہ ہے اور دوسرے: یہ کہ اسلام ان میں سے کسی چیز کی بنیاد پر انسانوں کے مابین تفریق و تقسیم کا قائل نہیں بلکہ وہ ایک خالص نظریاتی معاشرہ اور ریاست قائم کرنا چاہتا ہے اس کے یہاں انسانوں کے مابین صرف ایک تقسیم معتبر ہے اور وہ ہے ایمان کی تقسیم اور اہل ایمان کے حلقے میں بھی اس کے نزدیک صرف ایک معیار عزت و شرف معتبر ہے اور وہ ہے تقویٰ کا معیار!

اس سلسلے میں ضمنی طور پر ایک دوسری نہایت اہم حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہوگیا۔ یعنی یہ کہ اسلامی معاشرہ اور ریاست کا باقی انسانی معاشروں اور ریاستوں سے ربط و تعلق ان دو بنیادوں پر قائم ہوسکتا ہے جو پوری نوعِ انسانی کے مابین مشترک ہیں یعنی ۱۔ وحدتِ اِلٰہ اور ۲۔ وحدتِ آدم۔ اسی اہم حقیقت کو اجاگر کرنے کے لئے اس مقام پر تخاطب اس سورت کے عام اسلوب سے ہٹ کر بجائے "یا ایھا الذین اٰمنوا" کے "یا ایھا الناس" سے ہوا (واضح رہے کہ قرآن کریم میں سورۂ حجرات کی اس آیۂ مبارکہ کا مثنیٰ سورۂ نساء کی پہلی آیت ہے جس میں یہ تمام حقائق ایک عکسی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں!)

۲۔ دوسری اہم بحث اسلام اور ایمان کے مابین فرق و تمیز کی وضاحت سے متعلق ہے!

واضح رہے کہ قرآن حکیم میں ایمان و اسلام اور مومن و مسلم کی اصطلاحات اکثر و بیشتر ہم معنی اور مترادف الفاظ کی حیثیت سے استعمال ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ اور ایمان انسان کی جس داخلی کیفیت کا نام ہے اسلام اسی کا خارجی ظہور ہے لہٰذا جو انسان قلب میں ایمان و یقین کی دولت رکھتا ہو اور عمل میں اسلام اور اطاعت کی روش اختیار کرلے اُسے اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى یا ایک انگریزی مقولے[1] کے مصداق چاہے مومن کہہ لیا جائے چاہے مسلم بات ایک ہی ہے بخلاف اس مقام کے کہ یہاں ایمان و اسلام کو ایک دوسرے کے مقابل لایا گیا ہے اور ایمان کی نفی کامل کے علی الرغم اسلام کا اثبات کیا گیا ہے۔

اس مقام پر اس بحث کے لانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہ اہم اور بنیادی حقیقت واضح ہو جائے کہ اسلامی معاشرے میں شمولیت اور اسلامی ریاست کی شہریت کی بنیاد ایمان پر نہیں ہے بلکہ اسلام پر ہے اس لئے کہ ایمان ایک باطنی حقیقت ہے جو کسی قانونی بحث و تفتیش اور ناپ تول کا موضوع نہیں بن سکتی لہٰذا مجبوری

---

[1] (CALL THE ROSE BY ANY NAME! IT WILL SMELL AS SWEET!)

ہے کہ دنیا میں بین الانسانی معاملات کو صرف خارجی رویّے کی بنیاد پر استوار کیا جائے جس میں ایمان کا زیادہ سے زیادہ صرف "اِقرار باللسان" والا پہلو شامل ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس بحث سے دو مزید عظیم حقائق کی جانب رہنمائی ہوگئی۔

ایک: یہ کہ انسان کی ایک ایسی حالت بھی ممکن ہے کہ اس کے دل میں تو نہ مثبت و ایجابی طور پر ایمان ہی متحقق ہو نہ منفی و سلبی طور پر نفاق۔ بلکہ ایک خلا کی سی کیفیت ہو لیکن اس کے عمل میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت موجود ہو۔ اس حال میں اگرچہ اس قاعدہ کلیہ کی رُو سے کہ بغیر ایمان انسان کا کوئی عمل بارگاہ خداوندی میں مقبول نہیں ہو سکتا۔ یہ چیز بھی مبنی بر عدل ہی ہوتی کہ ایسی اطاعت قبول نہ کی جاتی لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم ہے (جس کی جانب اشارہ دو اسمائے حسنیٰ غفورؔ اور رحیمؔ سے کر دیا گیا) کہ اس اطاعت کو بھی سند قبول عطا فرما دی گئی (واضح رہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری دور میں جب "وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا" کی صورت ہوئی تو اس وقت بھی بہت سے لوگوں کے ایمان و اسلام کی نوعیت یہی تھی اور بعد میں تو ہر دور میں امتِ مسلمہ کے سواد اعظم کا حال یہ رہا ہی ہے!)

دوسرے یہ کہ حقیقی ایمان کی بھی ایک جامع و مانع تعریف بیان ہوگئی اور واضح کر دیا گیا کہ فی الحقیقت ایمان نام ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم[1] پر ایسے پختہ یقین کا جس میں شکوک و شبہات کے کانٹے پیچھے نہ رہ گئے ہوں اور جس کا اوّلین اور نمایاں ترین عملی مظہر جہاد فی سبیل اللہ ہے یعنی یہ کہ انسان ہدایت آسمانی کی نشر و اشاعت اور حق کی شہادت اور اللہ کے دین کی تبلیغ و تعلیم اور اس کے غلبہ و اظہار کے لئے جان و مال سے کوشش کرے اور اس جد و جہد میں تن من دھن سب کو قربان کر دے آیت کے آخر میں مزید کھول دیا گیا کہ صرف ایسے ہی لوگ اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں۔

سورہ حجرات کی اس آیہ کریمہ (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ) نے گویا سورۂ والعصر میں بیان شدہ چار لوازم نجات کو دو اصطلاحات میں جمع کر دیا ہے۔ ایک ایمان حقیقی جو جامع ہے ایمان قولی اور عمل صالح دونوں کا اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جو جامع ہے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا۔ واخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین

---

[1] واضح رہے کہ دوسرے ایمانیات ان کے ذیل میں آپ سے آپ مندرج ہو گئے۔

تصانیف ڈاکٹر اسرار احمد

- تحریک جماعتِ اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ
- اسلام کی نشاۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام
- مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق
- WHAT DO THE MUSLIMS OWE TO THE QURAN
- راہ نجات : سورہ والعصر کی روشنی میں
- قرآن اور امن عالم

تالیف : ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

- اسلامی تحقیق کا مفہوم ، مدعا اور طریق کار

قیمت قسم اعلیٰ ۱/۵۰ — قیمت قسم ادنیٰ [illegible]

اور

ماہنامہ میثاق لاہور

زیر ادارت : ڈاکٹر اسرار احمد ایم اے ، ایم بی بی ایس

فی پرچہ ۱/- ——— چندہ سالانہ [illegible]

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

Regd. No. L. 7360

Monthly "MEESAAQ" Lahore

Vol. 20 | SEPTEMBER - OCTOBER 1973 | No. 9-10

طالبان علوم قرآنی کو مژدہ

★ مجموعہ تفاسیر فراہی رح

تالیف : امام حمیدالدین فراہی رح — ہدیہ ۲۴/-

اور

★ تدبر قران جلد سوم

تالیف : مولانا امین احسن اصلاحی

مشتمل بر تفسیر سورہ انفال تا سورہ بنی اسرائیل — ہدیہ ۳۶/-

کے کچھ نسخے جلد ہو کر موصول ہو گئے ہیں ۔ اور ایک محدود تعداد
میں آرڈر کی تعمیل فوری طور پر ممکن ہے ۔
(خرچہ پیکنگ و محصول ڈاک فی جلد ۳/-)

مزید برآں

★ حقیقت دین

تالیف مولانا امین احسن اصلاحی
(مشتمل پر حقیقت شرک ' حقیقت توحید ' حقیقت تقوی ' اور حقیقت نماز)
بھی ترسیل کیلئے تیار ہے ۔ ہدیہ فی جلد ۱۲/- محصول ڈاک ۲/-

شائع کردہ :

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

پبلشر : محی الدین ، طابع : شیخ محمد اشرف مالک اشرف پریس ایبک روڈ - لاہور
مقام اشاعت : ۱۲- افغانی روڈ - سمن آباد - لاہور (فون : ۶۸۲۴۵)